سلسلہ

فلسفہ و علم کلام

کا

نمبر پہلا

العقل والنقل

۱۳۵۵ھ ۱۹۳۶ء

جس میں مستند حوالوں اور محققانہ مباحث کے بعد ثابت کیا گیا ہے کہ عقل سلیم اور نقل صحیح میں کبھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اور یہ کہ کبھی عقل کی سلامتی یا نقل کی صحت میں قصور ہونے کی وجہ سے ایسا پیش آئے تو اس وقت اس کا فیصلہ کس طرح ہونا چاہیے

مؤلفہ

جامع معقول و منقول مولٰنا شبیر احمد صاحب عثمانی صدر مہتمم دار العلوم دیوبند

جسکو

احقر مولوی سید احمد مدیر کتب خانہ اعزازیہ دیوبند نے خاص اہتمام سے اپنے

کتبخانہ اعزازیہ دیوبند سے شائع کیا

شرح نقایہ محشی عربی

کون ہے؟ جو ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ کی علو مرتبت اور علمی رفعت و جامعیت سے ناواقف ہوگا۔ مذہب حنفی ان کی محققانہ علمی کاوشوں کا جس درجہ رہین منت ہے وہ طبقہ علماء سے پوشیدہ نہیں۔ علامہ موصوف کی علمی یادگاروں میں سے مختصر الوقایہ کی شرح مسمّٰی بہ شرح نقایہ ان بلند پایہ علمی فقہی تحقیقات کا خزینہ ہے۔ جسکی تلاش میں اکثر علماء سرگرداں نظر آیا کرتے ہیں علامہ موصوف نے اپنی اس گرانمایہ شرح میں اس کا التزام کیا ہے کہ تمام مسائل فقہیہ احناف کو بدلائل احادیث صحیحہ مع بیان ادلہ وحوالہ کتب برعایت اصولِ فقہ نہایت بسط وشرح کے ساتھ ایسا مدلل کر دیا ہے کہ کسی ایک مسئلہ فقہی کو بھی تشنہ کام دلیل نہیں چھوڑا جس سے یہ خزینۂ علمی فقہ حنفیہ کی ایک ایسی جامع مدلل و مبرہن کتاب ہوگئی ہے کہ جس کے بعد کسی کو ایک مسئلہ فقہی کے متعلق بھی مؤید من الحدیث ہونے میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہجاتی، یہ فقہ حنفیہ کی گرانقدر کتاب آج تک ہندوستان میں اشاعت پذیر نہیں ہوئی تھی اور سوائے ہندوستان کے دو تین بڑے ذاتی اور غیر تجارتی کتب خانوں کے کہیں اسکا وجود بھی نہ تھا جس کی وجہ سے اہل علم حضرات اس کے علمی وفقہی دقائق ومعارف سے اب تک محروم تھے۔

حضرت الحاج المولانا مولوی حافظ **محمد اعزاز علی صاحب** مدظلہ شیخ الادب والفقہ ومفتی اعظم دارالعلوم دیوبند کو فقہ حنفی سے جو خداداد دلچسپی ہے اس کی زندہ مثال مولانا کی وہ علمی وفقہی خدمات ہیں جو نور الایضاح وکنز الدقائق وغیرہ کی صورت میں اہل علم حضرات کے روبرو موجود ہیں، فقہ حنفیہ کی اس گرانقدر و گرانمایہ کتاب کی اشاعت کا خیال حضرت مولانا مدظلہم کے قلب میں ایک عرصہ سے موجود تھا اور مولانا کی تمنا تھی کہ جس طرح نور الایضاح درس فقہ کی ایک مقبول ومستند کتاب شمار کی جاتی ہے اسی طریقہ سے **شرح نقایہ** مدارس عربیہ اسلامیہ وطلباء علوم الٰہیہ کے ہاتھوں تک پہنچکر تلقی بالقبول کا درجہ حاصل کرے۔

الحمد للہ علیٰ احسانہ کہ حضرت مولانا کی توجہات علمی کی برکت سے یہ فخر **کتب خانہ اعزازیہ دیوبند** کو نصیب ہوا کہ اس نے اس دُرِ نایاب کتاب کی اشاعت وطباعت کا اہتمام کیا اور حضرت مولانا مدظلہم العالی نے اصل کتاب کو اپنے حاشیہ سے زینت بخش کر اس کی علمی دلچسپیوں میں مزید اضافہ فرما دیا اور اس کتاب کی جملہ نگرانی وصحت وغیرہ کی طرف بھی حضرت مولانا نے خاص توجہ فرمائی ہے۔

چنانچہ الحمد للہ کہ اس گوہر بے بہا کی **جلد اوّل** طبع ہو کر آگئی ہے اور **جلد ثانی وثالث ورابع** زیر طبع ہیں اور چونکہ پہلی مرتبہ اس کے خاص اہتمام کی وجہ سے قلیل تعداد میں طبع کرائی گئی ہے اس لئے مہتممان مدارس اسلامیہ وطلباء کرام جلد توجہ فرمائیں تاکہ ختم ہونے پر طباعتِ ثانیہ کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ **تاجران کتب** کو معقول کمیشن دیا جائیگا۔ کتاب ہذا اپنے شہر کے تاجران کتب سے خرید فرما دیں اس میں آپ کو محصولڈاک کی کفایت رہے گی نہ ملنے کی صورت میں براہ راست ہم سے طلب فرمایئے۔ ہمارے اس دینی مذہبی **کتب خانہ** میں علاوہ مطبوعات ہند کے مطبوعہ مصر وبیروت واستنبول وغیرہ ہر وقت کافی مقدار میں موجود رہتی ہیں۔ مال بکفایت اور عمدہ جلد روانہ ہوگا۔ امید ہے کہ ہر علمی ضرورت کے وقت اس کتب خانہ کو یاد فرمائیں گے۔ قیمت جلد اول تین روپیہ

پتہ

(مولوی) **سید احمد ناظم کتب خانہ اعزازیہ دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی مذہب اسلام اور فلسفہ
یونان میں جب جنگ ہوئی تو مسلمانوں نے علم کلام کے زبردست ہتھیاروں سے اُس کا
قطعی فیصلہ کر دیا اور اسلام کو ایسے مضبوط فصیلوں اور دمدموں سے محفوظ کیا جنکے
مقابلہ میں اعلٰے سے اعلٰے قلعہ شکن توپیں بھی اپنا کوئی اثر نہ دکھلا سکیں۔

یہ کہنا بالکل مبالغہ سے خالی ہے کہ **متکلمین** نے مذہب کی سطح پر قائم رہکر
حجت و استدلال کے متعلق جو کچھ اصول اور قواعد وضع کئے اُن سے تمام باطل توہمات
کی قلعی کھل گئی **فلسفہ یونان** کی ملمع سازیوں کا طلسم ٹوٹا معترضین کی ابلہ فریبیوں کا پردہ
فاش ہوا۔ اور قیامت تک کیلئے مخالفین کی نکتہ چینیوں کا سدباب کر دیا گیا۔ لیکن افسوس
کہ ہمارے زمانہ کے بعض کوتاہ نظروں کی تسلی اس پر بھی نہوئی اور وہ علم کلام کو آج کل کی
ضروریات کے حق میں ناکافی ہی سمجھتے رہے۔

ابھی کچھ عرصہ ہوا یورپ سے یہ صدا اٹھی کہ علوم جدیدہ نے تمام مذاہب کی بنیاد ہلا

میں تزلزل پیدا کر دیا اور مختلف ادیان عالم میں سے ایک مذہب بھی اُس کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکا۔

جن لوگوں کو ہر بات کی تصدیق کے لئے یورپ کی وحی کا انتظار رہتا ہے بے چون و چرا اس پر ایمان لے آئے اور ملک میں اس خیال کو اس قدر شہرت دی کہ اس سرے سے اُس سرے تک جا بجا یہی چرچا ہو گیا۔ علماء نے یہ دیکھکر کہ عام لوگ مذہب سے بددل ہوئے جاتے ہیں۔ اس کی تحقیق کی طرف توجہ کی مگر تفتیش کے بعد ثابت ہوا کہ اس دعویٰ میں واقعیت کا بہت ہی کم حصہ شامل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ علمائے سائنس نے مادیات اور طبیعات کے متعلق بہت سی جدید باتیں دریافت کیں۔ علم ہیئت (علم الافلاک) میں مفید بیانات کا اضافہ کیا صنعت و دستکاری کے عجیب و غریب کرشمے دکھلائے۔ روشنی اور بجلی وغیرہ کے متعلق جدید تحقیقات سے عالم کو منور کر دیا لیکن انھوں نے یہ نہیں بتلایا کہ ان میں سے کون سی بات اسلام کے مخالف ہے یا کس چیز کے ثابت ہونے سے کسی اسلامی مسئلہ پر نقص وارد کیا جا سکتا ہے؟ فرض کرلو کہ عناصر کی تعداد (۶۷) سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ یہ بھی تسلیم کرلو کہ زمین ساکن نہیں متحرک ہے یہ بھی مان لو کہ کواکب سیارہ سات میں منحصر نہیں مگر کیا اس سے توحید کے ثبوت میں کچھ خلل آیا۔ یا نبوت کا دعویٰ باطل ہو گیا۔ کسی آیت قرآنی کی مخالفت ہوئی یا حدیث رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کیا گیا۔ جب ان میں سے کچھ بھی نہیں تو اب یہ دیکھو کہ علوم جدیدہ نے اسلامی مسائل کے متعلق رداً یا قبولاً کس چیز کی زیادتی کی۔

اس کے جواب میں اُن چند بوسیدہ اور پامال اعتراضات کے سوا کچھ نہیں کہا جاتا جو حدوث مادہ ثبوت معجزات اور حشر و نشر وغیرہ کے متعلق عام طور پر زبان زد ہیں

اور جن کو ہمارے زمانہ کے بعض آزاد خیال مولفین نے اردو زبان میں ذرا سلجھا کر تحریر کر دیا ہے لیکن جن لوگوں نے علم کلام کی تکمیل کو صرف شرح عقاید خیالی کے دائرہ میں محدود نہیں سمجھ رکھا وہ خوب جانتے ہیں کہ علماء اسلام نے کہاں تک ان تمام شبہات کا رکیک اور بیجان ہونا ثابت کیا ہے اور کس خوبی اور بسط کے ساتھ ان اعتراضات کا رد لکھا ہے کاش میری اس تحریر کے پڑھنے والے ابن حزم ظاہری کی ملل ونحل علامہ علاؤ الدین علی طوسی کی کتاب الذخیرہ۔ فاضل تفتازانی کی شرح مقاصد امام غزالی کی تہافتہ الفلاسفہ اور محققین فن کی نادر تصنیفات کا مطالعہ کریں جس سے اُن کے روبرو میرے اس بیان کی صداقت ظاہر ہو۔

اس بات کا کہدینا اُس کے ثابت کرنے سے زیادہ آسان ہے کہ علوم جدید کی روشنی میں تمام قدیم علوم ماند پڑ گئے اُس کے مقابلہ میں متکلمین کی تحقیقات بالکل بیکار ثابت ہو گئیں اور اُس کے دُنیا میں آنے سے مذہب کو موت کا سامنا کرنا پڑا۔

کیا یہ دعوی کرنیوالے ہمکو خاص اُن مضامین کی (ایک فہرست دیکر ممنون بنا سکتے ہیں جنکو اسلام اور متکلمین اسلام کے دلائل کے مخدوش بنانے میں کسی قسم کا دخل ہو اور جن کی صحت وسقم پر قدیم علم کلام نے بہت کافی طور پر بحث نہ کی) ہو۔

ہماری ایسے لوگوں سے جو حال کے علماء کو جدید حملوں کی مدافعت سے عاجز بتلاتے ہیں یہ التجا ہے کہ وہ ضرور ہمکو ایسے مسائل کی مع اُن کے دلائل کے ایک فرد تیار کرکے عنایت فرمائیں جن کا مقابلہ ہمارے بوڑھے اسلام سے نہ ہو سکا اور آخر کار ہمارے سی ایس آئی بہادر کو اُس کے ضعف اور پیرانہ سالی پر رحم کھا کر اُس میں بہت کچھ اصلاح کرنے کی ضرورت پیش آئی تاکہ یہ ترمیم شدہ اسلام نوجوان یورپ کی نظروں میں وقیع اور

باعظمت بن سکے۔ بہر حال۔

اپنی جہالت کیوجہ سے جسکا جو جی چاہے کہے مگر انصاف یہ ہے کہ اسلامی عقائد کے متعلق متکلمین نے جس درجہ موشگافی باریک بینی اور فلسفیانہ نکتہ رسی سے کام لیا ہے اس نے ہمیشہ کیلئے ہم کو اندرونی اور بیرونی مخالفین اسلام پیچیدہ اعتراضات کے حل کرنے سے سبکدوش کر کے انکا ممنون احسان بنا دیا اور میں جرأت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب بھی دنیا میں امام ابوالحسن اشعری اور ابوالمنصور ماتریدی کے ایسے وکیل موجود ہیں جو اسلامی معتقدات کے متعلق ان تمام شبہات کا استیصال کرتے ہوئے جو کسی نئے سے نئے پیرایہ میں ظاہر کئے جائیں قدیم علم کلام کے کامل و مکمل ہونیکا ثبوت دے سکیں۔

ہم نے اپنے اُن دوستوں کو جو قدیم علم کلام کو اکثر ناقص بتلایا کرتے ہیں بارہا یہ بھی کہتے سنا ہے کہ قدیم علم کلام میں صرف عقائد اسلام کے متعلق بحث ہوتی تھی کیونکہ اُس زمانے میں مخالفین نے اسلام پر جو اعتراض کئے تھے عقائد ہی کے متعلق تھے لیکن آجکل تاریخی اخلاقی تمدنی ہر حیثیت سے مذہب کو جانچا جاتا ہے یورپ کے نزدیک کسی مذہب کے عقائد اس قدر قابل اعتراض نہیں جس قدر اُس کے قانونی اور اخلاقی مسائل ہیں اُن کے نزدیک تعدد نکاح۔ طلاق۔ غلامی۔ جہاد کا کسی مذہب میں جائز ہونا اُس مذہب کے باطل ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے اس بنا پر علم کلام میں اس قسم کے مسائل سے بھی بحث کرنا ضروری ہے اور یہ حصہ بالکل قدیم علم کلام میں موجود نہیں۔

ہمارے ان احباب کا یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ قدیم علم کلام کا تعلق صرف عقائد ہی سے ہے قانونی اور اخلاقی مسائل سے اُس میں مطلقاً بحث نہیں کی گئی لیکن متکلمین یہ نہ کرتے تو کیا کرتے علم کلام کا مقصد ہی عقائد تک محدود تھا۔ قانونی اور اخلاقی مباحث کیلئے اُس کی

وضع ہی نہ تھی ان چیزوں کیلئے دوسرے علوم کی حاجت تھی چنانچہ فن تصوف و اخلاق اور علم اسرار الدین نے اس ضرورت کو بھی رفع کیا اور اسلام کی تمام جزئیات نماز۔ روزہ حج زکوٰۃ نکاح۔ طلاق۔ جنگ و جہاد کے مخفی اسرار اور حکمتوں کو نہایت تفصیل کیساتھ ظاہر کر دیا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی قیمتی تصنیفات اس وقت بھی کثرت سے موجود ہیں جنکے مطالعہ سے میرے اس بیان کی پوری تصدیق ہو سکتی ہے اور اس عنوان کے ذیل میں جس سلسلہ مضامین کے لکھنے کا میں ارادہ کر رہا ہوں اُس میں اس کا خیال رکھونگا کہ حسب موقع ان بیش بہا تصانیف سے مفید اقتباسات حاصل کروں۔

ہر کیف علم کلام جس غرض کی تکمیل کے لئے مدوّن کیا گیا میرے نزدیک اُس نے اُس میں پوری کامیابی حاصل کی اور اب میرا مقصد ہے کہ میں اسلامی عقائد کے ہر باب کے متعلق بصورت رسائل عدیدہ یہ دکھلاؤں کہ علمائے اسلام نے اُس کو تحقیق کی کس حد تک پہنچا کر چھوڑا ہے اور اب ہمکو اُس میں کہانتک ترمیم یا اصلاح کرنے کی ضرورت ہے لیکن مجھ کو اپنے اصلی مقصد کے شروع کرنے سے پہلے جیسا کہ چند اُن مقدمات کا ذکر کر دینا ضروری ہے جن کے بغیر ہمارا مقصد کامل طور پر اور آسانی کے ساتھ دل نشین نہیں ہو سکتا اسی طرح بعض دران خطرناک غلطیوں پر مطلع کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو اُصول کے طور پر عام مسلمانوں میں تسلیم کر لی گئی ہیں اور جو آگے چلکر ہمارے ناظرین کو بعض اصلی مقاصد کے سمجھنے میں مزاحم ہو سکتی ہیں۔

لیکن جس اہم کام اور طویل الذیل سلسلہ کا میں نے بیڑا اٹھایا ہے اور جس کا آغاز بنام خدا آج اس رسالہ سے کیا جاتا ہے وہ اُسی وقت انجام کو پہنچ سکتا ہے جبکہ اس مضمون کے

پڑھنے والے کلمات خیر سے میری ہمت بڑھائیں اور خدا کی توفیق شامل حال رہے اور عجب نہیں کہ اگر اس ناچیز مضمون کا کوئی حصہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا تو پھر ہمکو قدیم وجدید ہیئیت کے مسائل کے موازنہ کرنے کی بھی اپنے دسترس کیموافق جرأت ہو اور اگر زندگی ہے تو انشاءاللہ ہم علوم جدیدہ کے متعلق اپنی معلومات بڑھانے کی کوشش اور اس مقصد کی تکمیل کی ضرور فکر کریں گے۔ شعر

لے بسا آرزو کہ خاک شدہ
در میر یم عذرہا پذیر

اس سے قبل کہ توحید۔ رسالت اور جزا و سزا وغیرہ اسلامی اصولوں میں سے ہر ایک اصول کی علیحدہ علیحدہ رسائل کے ذریعہ سے بلا شائبہ تعصب مفصل تحقیقات کی جائے اس ایک رسالے میں چند ایسے امور کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو اُن مباحث میں امداد دینے کے علاوہ اس موقع پر ایک خاص قسم کی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ امور درحقیقت ایسے قوانین ہونگے جن کی صحت اُن محسوسات اور بدیہات پر مبنی ہوگی جو ہر طرح سے قابل اطمینان ہیں اور انہی سچے قوانین کی میزان سے ہم آیندہ چلکر اسلامی مسائل کی پوری پوری جانچ کر سکیں گے گویا یہ مقدمات ہمارے نزدیک اُن اصول موضوعہ کے طور پر لکھے جائیں گے جن کے سہارے ہمارے اکثر بیانات کی بنیادیں قائم ہوں گی۔

اب اگر کسی صاحب کو ان میں سے کوئی اصول مشتبہ یا غلط نظر آئے تو وہ بہت شوق کیساتھ اپنے اعتراض کو ظاہر فرماویں لیکن اپنے کسی ایک دعویٰ کے ثبوت میں بھی چند کہنہ سال یورپین کا نام لینے پر اکتفا نہ کریں تاوقتیکہ اُن کے پاس ایسی ہی کوئی دلیل قطعی نہو جیسا کہ ہم اپنے ہر ایک دعویٰ کے ساتھ ساتھ پیش کریں گے یا جیسی دلائل قویہ کا وہ ہم سے خود مطالبہ فرمانے کو تیار ہوں گے اور اگر وہ صاحب صرف چند جرمنی اور فرانسیسی

مصنفین کے اقوال یاد کر لینے ہی کو علوم جدیدہ میں ماہر ہونا تصور کرتے ہوں تو بحمد اللہ ایسے مباحث سے بھی گو ہم اپنے کو عاجز نہیں پاتے مگر جب ایسے دوراز کار فضولیات کا منظر سامنے ہوگا تو ہماری طبیعت بھی صرف اسی قدر جواب کو پسند کریگی کہ شعر

مدعی گو برو و نکتہ بحافظ مفروش
کلک ما نیز زبانے و بیانے دارد

اس لئے ایسے لوگوں کی خدمت میں ہم عرض کئے دیتے ہیں کہ وہ براہ کرم اپنا اور ہمارا عزیز وقت ہرگز ضایع نہ فرمائیں بلکہ ذرا سی دیر کیلئے سخن پروری ہٹ دھرمی اور نفس پرستی کو فراموش کر کے اور آخرہ کی عام جوابدہی کو پیش نظر رکھکر ٹھنڈے دل سے اُن قیمتی مطالب کے سُننے میں مصروف ہو جائیں جو بڑی عرق ریزی کے بعد جمع ہو کر بنی نوع انسان کی ہمدردی کی خاطر منظر عام پر لائے جائیں گے۔

چونکہ ان مضامین کا سلسلہ اگر خدا کو منظور ہی تو عرصہ دراز تک قائم رہیگا اس لئے علم دوست احباب سے توقع ہی کہ اس سلسلہ کے تمام رسائل کو ایک جگہ جمع کرتے جائیں تاکہ پہلے میں دوسرا کا یا دوسرے میں پہلے کا کوئی حوالہ آئے تو اس مقام کو بے تکلف نکالکر دیکھ سکیں۔

اب ان تمام ہدایات کے بعد ہم اپنا اصلی مطلب شروع کرتے ہیں اور آرزومند ہیں کہ اس کے پڑھنے والے تمام پرانے وساوس اور اوہام سے دل کو پاک کر کے اور لا تنظر الی من قال و انظر الی ما قال کو سامنے رکھکر نیک نیتی اور انصاف پرستی کی داد دینے کیلئے آمادہ ہو جائیں وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

شعر

شاہا من ار بعرش رسانم سریر فضل
مملوک این جنابم و مسکین این درم

العقل والنقل

تمام اہل فہم کے نزدیک یہ مسلمات میں سے ہے کہ نقل صحیح یا عقل کامل کا اتباع انسان کے اولین فرائض میں سے ہے اور انہی دونوں کی اطاعت پر اس کے برگزیدہ کمالات اور حقیقی کامیابیوں کے حاصل ہونیکا انحصار ہے۔ پھر ہر چند کہ اہل تحقیق کے نزدیک ان دونوں حاکموں (عقل و نقل) میں کبھی نزاع اور خصومت بجز اس کے ممکن نہیں کہ یا نقل کی صحت مشکوک ہو یا عقل کی سلامتی میں کچھ نقصان اور فتور واقع ہو جائے مگر جب کبھی کسی وجہ سے کسی موقع پر ان دونوں میں خلاف محسوس ہوتا ہے تو انسان کے خیالات میں سخت تزاحم اور تذبذب پیدا ہو جاتا ہے اور دونوں جانبوں کی کھینچ تان سے اس کو یہ دشواری پیش آتی ہے کہ وہ ان میں سے کس کے حکم کو قبول اور کس کو رد کرے اگر دونوں کی تعمیل کرنا چاہے تو اس کی کیا صورت ہو اور کسی ایک کو ترجیح دے تو کیونکر دے۔

اس لئے سب سے پہلے مگر سب سے مشکل منزل (جس کے طے کئے بغیر ہم اپنے اصلی مدعا تک نہیں پہنچ سکتے) یہی ہے کہ عقل و نقل کا یہ قدیم جھگڑا چکایا جائے جس کی بدولت پچھلے زمانہ میں سینکڑوں دانشمند آدمیوں کی قربانی ہو چکی ہے اور بہت سے بے قصور لوگ دار پر کھینچ دیئے گئے ہیں جب کبھی مدعیان عقل نے قدم جمائے اہل نقل کے استیصال میں تسمہ باقی لگا نہیں رکھا) اور جب نقل کے بیوقوف پیروؤں کا دور دورہ ہوا تو انہوں نے بھی اپنے فریق مقابل کے حق میں سر قلم کرنے یا آگ میں جلا دینے سے کم کوئی سزا تجویز نہیں کی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس اختلاف عقل و نقل کی اصلی حقیقت کیا ہے۔ کیا اس خوفناک نزاع میں کوئی صحیح صورت تطبیق کی ممکن ہے۔ یا کسی اہل مذہب نے ان دونوں میں تطبیق دیجے

کی کوشش کی۔ کیا ان تطبیق دینے والوں میں سے کوئی ایک شخص بھی اپنی سعی میں کامیاب ہوا۔

یہ وہ سوالات ہیں جن پر غور کرنا ہر ایک مذہب والے کا فرض ہے۔ اور اس وقت ہم انہی مہتم بالشان امور پر کامل طریقہ سے ایسے آسان پیرایہ میں بحث کریں گے جس میں عام خاص عالم۔ جاہل اور ذکی غبی سب مساوی طور پر حصہ لیں۔

قدیم سے قدیم روایات پر عبور کرنے سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ عقل و نقل کی یہ نزاع اور باہمی کشمکش کسی ایک قوم، ایک ملک اور ایک ملت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ انسانی آبادی کے ہر طبقہ اور ہر حصہ میں دونوں قسم کی طبیعتیں ہمیشہ موجود رہی ہیں۔ جو زمانہ کسی قوم کے حق میں اعلیٰ درجہ کی وحشت بدویت اور عام تاریکی کا فرض کیا جائے۔ اُس میں بھی متمدن اقوام کی مانند دونوں طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں بعض لوگ اپنی عقل کے ایسے پابند اور خیالات کے ایسے محکوم ہوتے ہیں کہ جو چیز اُن کی عقل و ادراک سے خارج ہو اُس کو وہ واقع میں موجود ہی نہیں سمجھتے اور ان کے برخلاف بعضوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب وہ اپنے کسی بزرگ یا مذہبی مقتدا سے کوئی بات سن لیں تو بے چون و چرا اُن کے حکم کے سامنے گردن ڈال دیں بشرطیکہ اُس مقتدا کے مقتدا ہونے پر اُن کو پورا اعتماد حاصل ہو چکا ہو۔

اس کے بعد ان دونوں گروہوں میں طعن و تشنیع کا دروازہ کھل جاتا ہے پہلا گروہ دوسرے کو سادہ دل، کم عقل اور بے وقوف سمجھتا ہے اور دوسرا پہلے کو بے ادب۔ مغرور اور نافرمان قرار دیتا ہے رفتہ رفتہ دونوں میں کینہ اور بغض کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور زبان و دل سے گذر کر ہاتھ پاؤں تک جنگ و جدل کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔

یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر اس پر بھی امر متنازع فیہ کا تصفیہ نہیں ہوتا بلکہ طرفہ ماجرا یہ ہی کہ بسا اوقات ایک ہی شخص اور ایک ہی کتاب کے دو قول اس مسئلہ میں متناقص پہلو رکھتے ہیں اور ہماری حیرت اور تعجب کی اُس وقت کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہمکو کسی ایک ایسی مذہبی کتاب میں جو کسی فرقے کے نزدیک خطا و قصور سے بالکل پاک تسلیم کرلی گئی ہی وہ متعارض کلام اس بارے میں نظر پڑتے ہیں جب ہم موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کی ورق گردانی کرتے ہیں تو امثال سلیمان کے تیسرے باب میں یہ عبارت لکھی ہوئی ملتی ہی۔

"اپنے سارے دل سے خداوند پر توکل کر، اور اپنی سمجھ پر تکیہ مت کر اپنی ساری راہوں میں اس کا اقرار کر، وہ تیری رہنمائی کریگا اپنی نگاہ میں آپکو دانشمند مت جان۔ خداوند سے ڈر اور بدی سے باز رہ یہ تیری ناف کیلئے صحت اور تیری ہڈیوں کیلئے تراوٹ ہی۔"

اور انہی امثال کے آٹھویں باب میں لکھا ہی کہ۔

"کیا دانائی نہیں پکارتی اور کیا فہمید آواز بلند نہیں کرتی وہ سڑک کے پاس اونچے مقاموں کی چوٹیوں پر اور چوراہے کے چبوترے پر کھڑی ہوتی ہی وہ پھاٹکوں کے نزدیک شہر کے مدخل پر جہاں کے دروازوں میں داخل ہوتے ہیں چلاتی ہی کہ ای آدمیو میں تمہیں بلاتی ہوں اور بنی آدم کی طرف اپنی آواز اٹھاتی ہوں اے بیوقوفو خرد کو سمجھو اور اے جاہلو سمجھنے والا دل پیدا کرو سُنو کہ میں لطیف مضمون کہتی ہوں اور میرے لبوں سے جب وہ کھلتے ہیں تو سچی باتیں نکلتی ہیں کہ میرا منہ سچ کہتا ہی اور میرے لبوں کو شرارت سے نفرت

ہی میرے مُنہ کی ساری باتیں صداقت سے ہیں اُن میں کچھ ٹیڑھا ترچھا نہیں وہ سب اُس کے نزدیک جو دانش رکھتا ہی سیدھے ہیں اور ان کے خیال میں جو حقیقت شناس ہیں راست ہیں۔

اسی قسم کے متضاد بیانات انجیل مقدس میں بھی پائے جاتے ہیں کسی جگہ اپنی عقل پر خدا کی بندگی کا دارمدار رکھا ہی اور کہیں انسانی عقل۔ انسانی حکمت اور انسانی ادراک کو بالائے طاق رکھنے کی ہدایت کی ہی۔

پاؤل رسولؑ نے جو خط رومیوں کو لکھا ہی اُس کے الفاظ یہ ہیں۔

"غرض میں اپنی عقل سے خدا کی شریعت اور جسم سے گناہ کی بندگی کرتا ہوں[1]"

اس سے صاف ظاہر ہی کہ خدا کی شریعت کا اتباع وہ اپنی عقل کے بھروسہ پر کرتے تھے لیکن اس کے خلاف انہی پاؤل رسول نے جو خط کرنتیوں کو تحریر کیا ہی اس کی عبارت یہ ہے۔

"اور میری عبارت اور میرا وعظ انسانی حکمت کے دلفریب بات کے ساتھ نہیں لیکن روح اور قدرت کی دلیل کے ساتھ تھا تاکہ تمہارا ایمان نہ انسانی حکمت سے بلکہ خدا کی قدرت سے ثابت ہووے ہم کاملوں کے نزدیک حکمت کی بات بولتے ہیں مگر اس جہان کی اور اس جہان کے فانی حاکموں کی حکمت نہیں بولتے بلکہ ہم وہ حکمت الٰہی بولتے ہیں جو چھپی ہوئی ہی یعنی وہ پوشیدہ حکمت جسے خدا نے زمانہ کے آگے ہماری بزرگی کے لئے مقرر کیا تھا[2]"

پھر اسی صفحہ پر لکھا ہی کہ۔

---

[1] دیکھو انجیل مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۴۹۶ [2] دیکھو انجیل مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۵۲۸

"اب ہم نے نہ دنیا کی روح بلکہ وہ روح جو خدا سے ہے پائی تاکہ ہم اُن رازوں کو جو خدا نے ہمیں بخشے ہیں سمجھیں اور ہم اُن رازوں کو انسان کی سکھلائی باتوں سے نہیں بلکہ روح قدس کی سکھلائی ہوئی باتوں سے غرض روحانی چیزوں کو روحانی عبارت سے ملاکر بیان کرتے ہیں مگر نفسانی آدمی خدا کی روح کی باتوں کو قبول نہیں کرتا کہ اس کے نزدیک نادانی کی باتیں ہیں اور وہ اُن کو سمجھ نہیں سکتا کہ وے روحانی طور سے بوجھی جاتی ہیں"

شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی دونوں قسم کے مضامین موجود ہیں۔ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لوگ حسب جات عقل کے موافق جنت میں داخل ہونگے اکثر اہل الجنۃ بلہ (یعنی اکثر جنتی لوگ بیوقوف ہونگے) بھی مشہور ہے آپکے بعد جو علما اور حکما آپ کی اُمت میں گزرے اُن کے اقوال بھی اسی طرح بظاہر متعارض رہے اور امام غزالی کے زمانہ تک غالباً بہت کم عالم ادہر متوجہ ہوئے جنہوں نے اس عقل ونقل کے اختلاف پر باضابطہ اور مکمل بحث کی ہو اور تمام شبہات کو رفع کر کے یہ دکھلایا ہو کہ اس اختلاف کا اصلی منشا کیا ہے دونوں فریق کے استدلالات کس درجہ تک درست ہیں اور انبیا یا اکابر علما کی کتابوں میں جو بظاہر اختلافات معلوم ہوتے ہیں۔ جن کی طرف ہم نے بھی اشارہ کیا ہی ان کے اجتماع اور تطبیق کی صحیح صورت کیا ہی۔

میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ امام غزالی سے پہلے کوئی شخص عقل ونقل کی تطبیق کی صورت سمجھے ہوئے نہ تہا بلکہ یہ غرض ہی کہ اُن سے پہلے اس مسئلہ کی خاص تشریح کرنیکی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ ہر ایک زمانہ کے حکما انہی امور کے بیان میں زیادہ تاکید وتفصیل سے کام لیا کرتے ہیں جن میں کسی قسم کے خفا اور مغالطہ کا اندیشہ ہو یا وہ ایسے امراض ہوں جن کے اندر عام طبائع مبتلا پائی جائیں۔

تم خود اندازہ کرلو کہ والدین کی اطاعت اور اولاد پر ترحم اور شفقت یہ دونوں چیزیں باوجودیکہ مذہبی ضروریات میں سے ہیں۔ مگر اوّل چونکہ ایک گونہ نفس کی خواہش کیخلاف اور دوسرے نہ تنہا انسان بلکہ تمام حیوانات کی اقتضاآت طبعیہ میں سے ہی اس وجہ سے حکیم مطلق نے عقوق والدین کی خرابی اور اُن کی اطاعت کی خوبی کو بکراّت ومرات اور باجمال وتفصیل جس قدر مختلف عنوانون سے تعلیم فرمایا ہی رحم علی الاولاد کے احکام میں اُس کا عشر عشیر بھی نہیں۔

ٹھیک اسی طرح علمائِ سلف کے زمانہ میں چونکہ عام طور پر مذہبی روایات کا اعتماد قائم تھا اور زید عمرو بکر کی رائے اور خیال سے اُن روایات کا بدل ڈالنا کسی اہل مذہب کے نزدیک بھی روا نہ تھا اس لئے نہ عقل ونقل میں بکثرت منازعات قائم ہوتے تھے نہ علمار کو ان دونوں کے مقدمات فیصل کرنیکی نوبت آتی تھی اور نہ اس کی حاجت سمجھی جاتی تھی کہ ان دونوں کی تطبیق کے اصول یا اختلاف کے اسباب بیان کئے جائیں۔

اس کے بعد جوں جوں زمانہ گزرا۔ فلسفیت اور الحاد کا رنگ غالب آیا عقول ناقصہ جزئیہ کی گرم بازاری ہوئی اور نقل کی قدرومنزلت گھٹی اسی قدر عقل ونقل کی منازعت بڑھتی گئی اور امام غزالی کے زمانہ تک اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ ان دونوں (عقل ونقل) کی موافقت واتحاد کے واسطے کچھ آئین بتلائے جائیں اور ان میں سے ہر ایک کے حدود کی تعیین وضاحت کیساتھ کردی جائے چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اُس پر قلم اٹھایا اور انصاف یہ ہی کہ انھوں نے اپنے زمانہ کی ضروریات کے موافق اس مقصد کی پوری تکمیل کردی۔

لیکن چونکہ علمائِ سلف کو اس تعیین وتفصیل کی حاجت پیش نہیں آئی تھی اور علما مابعد

نے امام صاحب ممدوح کی تشریحات پر حوالہ کر دینے کو کافی سمجھا اسواسطے الناسی پہلے اور اُن کے بعد اکثر ایسے ہی مبہم اور متعارض اقوال عقل و نقل کے بارے میں جمع ہوتے رہے جس سے آجکل کے کوتاہ نظروں کو سادہ لوح عوام کے گمراہ کرنیکا خوب موقعہ ہاتھ آیا اور انھوں نے بزرگوں کے کلام کے وہ مختلف ٹکڑے جنکو امام غزالی نے احیاء العلوم وغیرہ میں عمدہ طور پر جمع کر کے دکھلا دیا تھا جا بجا اپنے استشہاد میں پیش کر کے سیدھے اور سچے مسلمانوں کو طریق حق سے ہٹانا چاہا چنانچہ اب میں اس قسم کے اکثر کلام حکمأ اور علمأ اسلام کی کتابوں سے انتخاب کر کے ذیل میں نقل کرتا ہوں جن کو پڑھکر ایک خالی الذہن آدمی سخت تحیر اور تذبذب میں پڑ جاتا ہی اور اُس کے بعد امام غزالی کی مفصل تقریر ان کی متفرق تصانیف سے اقتباس کر کے ہدیہ ناظرین کروں گا جو اس حیرت اور پریشانی کو کافی حد تک مٹا سکے گی۔

البتہ یہ ضرور ہی کہ عقل و نقل کی جو مخالفت آجکل دیکھنے میں آرہی ہی کہ عرصہ ہوا دونوں حکومتیں سفرا اُٹھا چکے اور اعلان جنگ ہو کر لگاتار معرکہ آرائی ہونے لگی پھر لڑائی بھی باقاعدہ نہیں بلکہ زمانہ حال کی عقل نے غدر پر کمر بستہ ہو کر محض جابرانہ کارروائی شروع کر دی چونکہ یہ بہار یا خزاں نہ امام غزالی نے دیکھی تھی اور نہ اُن سے پہلے کسی اور نے اس لئے اگر زمانہ حال کی بعض خصوصیات پر نظر کر کے امام غزالی کی تقریر میں بھی کوئی کمی ہو گی تو میں اُسکو آزادانہ ظاہر کرونگا اور پھر کسی اور عالم کی تقریر اگر اُن کی تقریر سے زیادہ تسکین بخش سمجھی جائیگی تو اُس کو سب سے آخیر میں درج کروں گا تاکہ ہمارے رسالہ کے وہ ناظرین بھی جنکے دلوں میں اس زمانہ کی اندیشہ ناک آزادی کا کوئی اثر آیا ہو اوّل سے آخر تک تمام آرار کا موازنہ کر کے بیکدلی کیساتھ سچائی اور راستی کو قبول کر سکیں وللہ درمن قال ؎

دورِ عجبے گردش این دائرہ دارد | وقتی است کہ گردوں بگزارد دوراں را
اکنوں اثر تربیت دہر بر آں است | تا صورت خر مہرہ دہد نطفہ رکاں را
بر خاستہ زیں شور زمیں چند نجارے | یکسر بکف غول ہوا داد عناں را
سیمرغ خورد و قوت پرواز مگس نیست | بال و پر این بیچہ ال ہمہ واں را

سب سے پیشتر ہم اُن حامیاں عقل کی طرف رجوع کرتے ہیں جو عام طور پر فلاسفہ اسلام یا حکمائے اسلام کے لقب سے مشہور ہیں اور جنکی زندگی کا اکثر حصہ عقل کی پیروی میں صرف ہوا ہے شیخ بو علی سینا اور ابن رشد اندلسی اس گروہ کے بہت بڑے امام گذرے ہیں۔ شیخ نے اشارات کے آخر میں ایک مستقل باب اسکے لئے منعقد کیا ہے کہ انبیاء اور اولیاء کے بہت سے علوم ممکن ہے کہ عقول متوسطہ کے مرتبہ سے بالاتر ہوں وہ درحقیقت صحیح ہوں مگر عام طور پر لوگ اُن کو سمجھ نہ سکیں کیونکہ جو چیز انسان میں علوم اور ادراکات کی حاصل کرنیوالی ہے وہ ایک لطیف چیز ہے جس کو رُوح سے تعبیر کرتے ہیں اور جب علم کے حاصل ہونے کا مبنیٰ وہی جز لطیف ٹھہرا تو جس قدر جسم کی کثافت کو بذریعہ مجاہدات اور ریاضات کے زائل کیا جائیگا اُسی قدر رُوح کی لطافت میں ترقی ہو گی اور لطافت کے بڑھنے سے علوم میں یقیناً وسعت پیدا ہوتی جائیگی۔ چونکہ انبیاء اور اولیاء بھی ترک لذات اور کسر شہوات کے بعد جسمانی تعلقات سے بہت کچھ بیگانہ ہو جاتے ہیں اس لئے اگر ان کو بہت سی وہ باتیں معلوم ہوں جو ہمکو نہ ہوں تو یہ کوئی قابل استعجاب امر نہیں ہے اس کے بعد شیخ کہتا ہے۔

والعارفون المتنزھون اذا وضع عنھم درن مقارنۃ البدن وانفکوا عن الشواغل خلصوا الی عالم القدس والسعادۃ وانتقشوا بالکمال الاعلی و

اور خدا کی معرفت رکھنے والی پاک بندی جس وقت ان سے جسمانی تعلق کا بار ہلکا کر دیا جاتا ہے اور دنیوی شاغل سے وہ علیحدہ ہو جاتے ہیں تو اُن کی توجہ خالص طور پر عالم قدس اور عالم سعادت کی طرف مبذول ہو جاتی ہے اور اعلیٰ درجے کے کمال کیساتھ

حصلت لهم اللذة العليا وقد عرفتها وليس هذا الا لذة اذ مفقودا من كل وجه والنفس في البدن بل المنغمسون في تامل الجبروت المعرضون عن الشواغل يصيبون وهم في هذه الابدان من هذه اللذة حظا وافرا قد يتمكن منهم فيشغلهم عن كل شئ۔[۱]

موصوف اور یہی لذت عظیٰ ہوا کرتے ہیں جیسا کہ تم پہلے معلوم کر چکے ہو۔ اور یہ نہیں کہ جب روح بدن میں ہو تو وہ اس لذۃ سے بالکل محروم رہیں بلکہ ایسے لوگ جو خدا کی عظمت و جبروت کی فکر میں ڈوبے ہوئے اور جسمی شغلوں سے اعراض کرنیوالے ہیں وہ ان اجسام میں رہکر بھی اس لذۃ سے اتنا بڑا حصہ پالیتے ہیں جو اثر غالب آکر تمام اشیاء سے ان کو فارغ کر دیتا ہے۔

شرح اشارات محقق طوسی میں ہے:-

جل جناب الحق تعالی ان یکون شريعة لكل وارد او يطلع عليه الا واحد بعد واحد ولذلك فان ما يشتمل عليه هذا الفن ضحكة للمغفل وعبرة للمحصل فمن سمعه فاشمأز عنه فليتهم نفسه لعلها لا تناسبه و كل ميسر لما خلق له والمراد ذكر قلة عدد الواصلين الى الحق والاشارة الى ان سبب انكار الجمهور للفن المذكور في هذا النمط هو جهلهم بها فان الناس اعداء ما جهلوا والى ان النوع من

خدائے تعالیٰ کی جناب اس سے اعلیٰ اور ارفع ہے کہ وہ ہر وارد اور صادر کی گذرگاہ بنجائے یا اُس پر مخصوص افراد کے سوا کوئی مطلع ہو سکے اور اسی وجہ سے صوفیوں کا طریقہ غافل کے نزدیک مضحکہ خیز اور طالب کے واسطے عبرت انگیز طریقہ ہے تو جو اُن کی باتوں کو سُنکر اُن سے اعراض کرے اسکو چاہئے کہ وہ اس بارے میں اپنی نفس کا قصور سمجھے۔ کیونکہ اس کو اُن سے مناسبت نہیں ہے اور ہر شخص کیواسطے وہی بات آسان ہوتی ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے خلاصہ یہ ہے کہ خدا رسیدہ لوگ بہت کم پائے جاتے ہیں اور اکثر لوگ باطنی طریقوں سے اس بنا پر انکار کرتے ہیں کہ وہ اسکو نہیں جانتے آدمی ہمیشہ نامعلوم بات کا دشمن ہوتا ہے پھر

[۱] منقول از شرح اشارات امام رازی مطبوعہ مصر صفحہ ۱۳۲۵ - ۱۲۔

والکمال لیس مما یحصل بالاکتساب المحض بل انما یحتاج مع ذلک الی جوھر مناسب لہ بحسب الفطرۃ[1]۔	یہ کمال ہر ایک کو محض حاصل کرنے سے حاصل نہیں ہوتا تاوقتیکہ اس کا جوہر طبیعت فطرۃً اس کے مناسب نہو۔

ان دونوں عبارتوں سے شیخ اور علامہ طوسی کا یہ مطلب ہے، کہ اگر انبیاؑ اور اولیاؑ سے بعض ایسے امور منقول ہوں جو ہماری عقل کے دائرہ سے باہر ہیں تو ہمکو ان کی اس بنا پر تصدیق کرنا چاہیئے کہ ان کے نفوس بہیمیت کی ظلمات اور بشریت کی کدورت سے پاک و صاف ہوتے ہیں اور ہمکو یہ سعادت حاصل نہیں ہوتی لیکن شیخ کی اس تقریر سے اس کا کوئی جواب نہیں نکلا کہ اس صورت میں ہندوستان کے جوگی۔ نصاریٰ کے راہب اور پہلا زمانہ کے اشراقیوں کے تمام علوم کیوں قابل تسلیم نہیں ہیں جبکہ روحانیت کی ترقی کا مدار تجرد اور ترک دنیا پر ہو تو ان لوگوں کا تجرد انبیاؑ اور اولیاؑ کے تجرد سے کیوں کم ہی بلکہ بظاہر یہ لوگ بہت زیادہ آدمیوں کی مجالست سے متنفر اور انسانی جذبات کے فنا کر دینوالے نظر آتے ہیں، چونکہ اس حیثیت سے شیخ کی تقریر بالکل ناقص ہے اس لئے اب ہم شیخ کو چھوڑ کر دوسرے علمأ کے اقوال کا مختصر انتخاب درج ذیل کرتے ہیں:۔

قاضی ابن رشد اندلسی جس نے امام غزالی کی کتابوں کا رد لکھا ہے اور جس کو اہلِ یورپ مسلمانوں کا سب سے بڑا فلسفی خیال کرتے ہیں ایک مقام پر لکھتا ہے کہ خدا کی برحق اور اپنی سچی کتاب میں ہم کو جا بجا قیاس اور استدلال کے طریقہ پر توجہ دلائی ہی اور ہر چیز کو عقل سے دریافت کرنیکے لئے آمادہ کیا ہی

واذا کانت ھذہ الشرائع حقا و	اور جب یہ شریعت سچی ہی اور لوگوں کو اس غور و فکر کیطرف

[1] شرح اشارات طوسی مطبوعہ مصر صفحہ ۳۹ ج ۲ ۱۲

داعیة الی النظر المؤدی الی معرفة الحق فانا معشر المسلمین نعلم علی القطع انه لا یؤدی النظر البرهانی الی مخالفة ما ورد به الشرع فان الحق لا یضاد الحق[1]

بلا رہی ہے جس سے خدا کی معرفت حاصل ہو تو ہم مسلمانوں کا قطعی یہ عقیدہ ہونا چاہئے کہ دلیل اور برہان کبھی شریعت کے خلاف کبھی ثابت نہیں ہو سکتا (کیونکہ شریعت بھی سچی ہے اور دلیل بھی سچی) اور ایک سچی بات دوسری سچی بات کے مخالف نہیں ہو سکتی۔

دوسرے موقعہ پر صوفیوں کے روحانی طریقہ کا ذکر کرکے لکھا ہے۔

ونحن نقول ان هذه الطریقة ان سلمنا وجودها فانها لیست عامة للناس بما هم ناس ولو کانت هذه الطریقة هی المقصودة بالناس لبطلت طریقة النظر ولکان وجودها بالناس عبثا والقرآن کله انما دعا الی النظر والاعتبار وتنبیه علی طرق النظر[2]

ہم کہتے ہیں کہ اس طریقہ کے وجود سے اگرچہ ہم کو انکار نہیں مگر اس میں شک نہیں کہ یہ طریقہ لوگوں میں عام نہیں ہو سکتا پس اگر اسی طریقہ کا رواج پانا شریعت کا مقصود ہوتا تو فکر اور استدلال کا وجود بالکل باطل اور عبث قرار پاتا حالانکہ سارا قرآن قیاس اور استدلال کی طرف بلا رہا ہے اور نظر کے طریقوں پر متنبہ کر رہا ہے۔

اس کے مقابلہ پر علامہ ابن تیمیہ رسالہ الفرقان میں لکھتے ہیں:

فمن جرب ما یقولونه (ای الانبیاء) ویقوله غیرهم وجد الصواب معهم والخطاء مع مخالفهم کما قال الرازی مع انه من اعظم الناس طعنا فی الادلة السمعیة حتی ابتدع قولا ما عرف به قائل مشهور غیره وهو انها تفید الیقین

تو جو شخص انبیاء علیہم السلام کے ارشادات اور لوگوں کے اقوال کا تجربہ کریگا وہ یقیناً انبیا کو حق پر اور ان کے مخالفوں کو خطا پر پائیگا دیکھو رازی جو سب سے زیادہ سمعی روایات کو غیر معتبر ٹھہرانیوالے ہیں یہانتک کہ انھوں نے ایک ایسی بات کہی جو ان سے پہلے کسی نے بھی نہیں کہی تھی یعنی یہ کہ روایات سے کبھی یقین کا مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا

---

[1] دیکھو فلسفہ ابن رشد مطبوعہ مصر صفحہ ۱ [2] دیکھو فلسفہ ابن رشد مطبوعہ مصر صفحہ ۳۵ ۱۲

ومع هذا فانه يقول لقد تأملت الطرق الكلامية
والمناهج الفلسفية فما رأيتها تشفي عليلا
وتروي غليلا ووجدت اقرب الطرق طريقة
القرآن اقرأ في الاثبات اليه يصعد الكلم الطيب
الرحمن على العرش استوى واقرأ في النفي
ليس كمثله شيء ولا يحيطون به علما" ومن
جرب مثل تجربتي عرف مثل معرفتي ايضا
فمن اعتبر ما عند الطوائف الذين لا
يعتصمون بتعليم الانبياء وارشادهم واخبارهم
وجدهم كلهم حائرين ضالين شاكين مرتابين
او جاهلين جهلا مركبا"[له]

اُس رازی کو بھی یہ کہنا پڑا کہ میں نے فلسفہ اور علم کلام کے
طریقوں میں بہت تامل کیا مگر اُن کو ہرگز ایسا نہ پایا جو ایک
مریض کو شفا بخشیں یا کسی پیاسے کو سیراب کر سکیں ہاں
تمام راستوں میں نزدیک تر راستہ قرآن کا ہے کہ ثبوت کی جانب
میں ہم یہ آتیں پڑھ لیتے ہیں الیہ یصعد الکلم الطیب الرحمن
علی العرش استوی اور نفی میں لیس کمثلہ شیٴ اور لا
یحیطون بہ علما اور جو کوئی مجھ جیسا تجربہ کریگا وہ بھی میری
طرح اس بات کو سمجھ لیگا اور نیز جو شخص ان لوگوں کے اقوال
میں غور کریگا جنہوں نے انبیا کی تعلیمات اور روایات سے استدلال
نہیں کیا تو وہ اُن کو تحیر شک گمراہی اور جہل مرکب میں
مبتلا پائیگا۔

شیخ اکبر محی الدین ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ نے جن الفاظ سے اپنے ایک خط میں امام فخر الدین
رازی کو نصیحت فرمائی ہے وہ اس سے بھی زیادہ صاف اور کھلے ہوئے الفاظ ہیں وہ امام رازی
کی حمیت دینے کا شکریہ ادا کر کے تحریر فرماتے ہیں۔ کہ

فاذن ينبغي للعاقل ان يتعرض لنفحات
الجود ولا يبقى ماسورا في قيد نظره وكسبه
فانه على شبهة في ذلك ولقد اخبرني من
الفت به من اخوانك ممن له فيك نية

اب عقلمند کیلئے مناسب ہے کہ وہ خدا کی جود و کرم کی خوشبوؤں سے
فائدہ اٹھائے اور نظر و استدلال کی قید میں نہ پھنسا رہے
کیونکہ وہ اس طرح ہمیشہ مشتبہ حالت میں رہتا ہے چنانچہ مجھ سے
تمہاری ایک دوست نے جو مجھ سے ملا اور تمہارے ساتھ

له دیکھو رسائل تیمیہ مطبوعہ مصر صفحہ ۱۰۹ ۱۲ ش

حسنة انصرافه وقد بكيت يوماً فسألك هو من حضره عن بكائك فقلت مسئلة اعتقدتها منذ ثلثين سنة فتبين لي الساعة بدليل لاح لي ان الامر على خلاف ما كان عندي فبكيت لعل الذي لاح لي ايضاً يكون مثل الاول فهذا قولك ومن المحال على الواقف بمرتبة العقل و الفكر ان يستريح او ان يسكن ولا سيما في معرفة الله تعالى فما بالك يا اخي تبقى في هذه الورطة ولا تدخل طريق الرياضات والمكاشفات والمجاهدات والخلوات التي شرعها رسول الله صلى الله عليه وسلم فتنال ما نال من قال فيه الله سبحانه عبداً من عبادنا اتيناه رحمة من عندنا وعلمناه من لدنا علماً ١٥

حسن عقیدت رکھتا تھا یہ بیان کیا کہ اُس نے تمکو ایک روز روتے ہوئے دیکھا جب اُس نے اور حاضرین نے رونے کی وجہ دریافت کی تو تم نے یہ جواب دیا کہ ایک مسئلہ جس پر تیس برس سے میں اعتقاد جمائے ہوئے تھا اسی وقت ایک دلیل سے مجکو غلط ثابت ہوا اسکے بعد مجکو کیا اطمینان ہے کہ جو تحقیق مجکو اب ظاہر ہوئی ہے وہ بھی پہلے کی طرح غلط ہوگی۔ یہ خود تمہارا قول ہے اور واقعی وہ شخص جو عقل اور استدلال کے مرتبہ سے آگے نہیں بڑھا ناممکن ہے کہ سکون واطمینان اور راحت حاصل کرلے۔ بالخصوص خدا تعالیٰ کی معرفت میں تو اے برادر پھر بھی تم کیوں اس گرداب (نظر وفکر) میں پڑے ہوئے ہو اور کیوں ریاضات۔ مجاہدات۔ مکاشفات اور خلوات کا وہ طریقہ اختیار نہیں کرتے جسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشروع کیا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تم بھی وہ چیز حاصل کرلو جو اُس بندے کی جس کی نسبت خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے اسکو خاص اپنے پاس سے رحمت اور علم عطا کیا۔

حضرت شیخ احمد صاحب سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اس مضمون کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔

بلکہ مقصود آنست کہ نسبت بمعتقدات

یعنی مقصود یہ ہے کہ لوگ اپنے اعتقادات میں ایسے مضبوط ہوں

١ دیکھو کشکول بہاء الدین عاملی مطبوعہ مصر صفحہ ١٢٣٤١

یقینی و اطمینانی حاصل کنند کہ ہرگز بہ تشکیک زائل نگردد و بایراد شبہہ باطل نہ شود۔ چہ پائے استدلال چوبیں است و مستدل بے تمکین۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب[۱]

اور ایسا یقین اور اطمینان حاصل کریں جسکو کوئی شک ڈالنے والا زائل نکر سکے۔ اور کسی کے شبہات پیدا کرنیسے جاتا رہے کیونکہ استدلال کے پاؤں لکڑی کے ہوتے ہیں اور مستدل ذرا سی دیر بھی نہیں ٹھہر سکتا خوب آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے ذکر سے ہی دل مطمئن ہوتے ہیں؟

ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں۔

"و چنانچہ طور عقل ورائے طور حس ست کہ انچہ بحس مدرک نشود عقل ادراک آں می نماید ہمچنیں طور نبوت ورائے طور عقل ست انچہ بعقل مدرک نشود بتوسل نبوت درک می آید و ہر کہ ورائے طور عقل طریقہ از برائے معرفت اثبات نمی نماید فی الحقیقت منکر نبوۃ ست و مصادم بداہتہ"[۲]

اور جیسا کہ عقل کا راستہ حواس کے راستے سے علیحدہ ہے کہ جو چیز حواس سے نہ جانی جائے عقل سے معلوم ہو سکتی ہے اسی طرح نبوت کا راستہ عقل کے راستے سے علیحدہ ہے یعنی جس بات کو عقل سے دریافت نہیں کر سکتے اسکو نور نبوۃ سے جان سکتے ہیں اور جو شخص عقل کے اوپر کوئی اور طریقہ علم کا تسلیم نہیں کرتا وہ درحقیقت نبوۃ کا منکر اور بداہت کا مخالف ہے۔

ذرا اور آگے چلکر لکھتے ہیں۔

"و بالجملہ طریق ریاضت و مجاہدات در رنگ طریق نظر و استدلال وقتے اعتبار پیدا کند کہ مقرون بتصدیق انبیاء بود۔ علیہم الصلوات والتسلیمات"[۳]

اور حاصل یہ ہے کہ ریاضات اور مجاہدات کا طریقہ بھی نظر اور استدلال کے رنگ میں اُسوقت قابل اعتبار اور اعتماد کے ہے جبکہ اسکی تصدیق انبیاء علیہم الصلوات والسلام کے ذریعہ سے ہو چکی ہو۔

علامہ ابن خلدون بھی مجدد صاحب کے پورے پورے ہمزبان ہیں۔ وہ مجدد صاحب

۱ه دیکھو مکتوبات مجدد صاحب مطبوعہ دہلی صفحہ ۳۳ جلد ۱ ۲ه دیکھو مکتوبات مجدد صاحب صفحہ ۲ جلد ۳
۳ه " " " " " صفحہ ۴۲ جلد ۳ - ۱۳

سے ذرا زیادہ تشریح کے ساتھ اپنے مقدمہ تاریخ میں تحریر کرتے ہیں۔

"فاتهم ادراکک ومدارکک
فی الحصر واتبع ما امرک الشارع
من اعتقادک وعملک فهو احرص
علی سعادتک واعلم بما ینفعک لانه
من طور فوق ادراکک ومن نطاق
اوسع من نطاق عقلک ولیس ذلک
بقادح فی العقل ومدارکه بل العقل
میزان صحیح فاحکامه یقینیة لا کذب
فیها۔ غیر انک لا تطمع ان تزن به امور
التوحید والآخرة وحقیقة النبوة و
حقائق الصفات الالهیة وکل ما وراء
طوره فان ذلک طمع فی محال۔ ومثال
ذلک مثال رجل رای المیزان الذی
یوزن به الذهب فیطمع ان یزن
به الجبال۔ هذا لا یدرک علی ان
المیزان فی احکامه غیر صادق لکن
لعقل قد یقف عنده ولا یتعدی
طوره حتی یکون له ان یحیط

پس تم اپنے علم اور معلومات کو اس حصر کر دینے میں خطا وار
سمجھو کہ جو ہم جانتے ہیں تمام موجودات اسی میں منحصر ہیں
اور شارع علیہ السلام کے بتلائے ہوئے اعتقادات اور اعمال کا
اتباع کرو کیونکہ وہ تم سے زیادہ تمہارے بہی خواہ اور سود و
بہبود کو سمجھنے والے ہیں اُن کا علم تمہارے علم سے اوپر اور
ایسے ذریعے سے حاصل ہونیوالا ہے جو تمہاری عقل کے دائرہ سے
وسیع تر ہو۔ باقی ہمارے اس کہنے سے عقل اور اُسکی معلومات
میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا بلکہ ہم عقل کو ایک میزان
صحیح سمجھتے ہیں جسکے احکام یقینی اور جھوٹ سے پاک ہیں۔ ہاں
یہ میزان اتنی بڑی نہیں ہے کہ تم اس سے توحید و آخرۃ کے
امور اور نبوت و صفات الٰہیہ وغیرہ کے حقائق کو وزن کرنے
لگو یہ تو ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شخص ایک سونے چاندی کی تولنے
کا کانٹا دیکھے اور اُس میں پہاڑوں کے تولنے کا ارادہ کرنے
لگے تو یہ نہ کہا جائیگا کہ ترازو وزن بتلانے کے اعتبار سے درست
نہیں ہے بلکہ یہ کہیں گے کہ ہر ایک میزان کیواسطے ایک حد
ہے جسکے آگے وہ کام نہیں دے سکتی اسی طرح میزان عقل بھی
ایک خاص موقعہ پر ٹھہر جاتی ہے اور یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ
اس سے آگے بڑھ کر خدا کی ذات و صفات کا احاطہ کرے کیونکہ خود عقل

"بالله وبصفاته فانه ذرة من ذرات الوجود الحاصل منه وتفطن في هذا اغلط من يقدم العقل على السمع في امثال هذه القضايا وقصور فهمهم واضمحلال رايه فقد تبين لك الحق من ذلك"[۱]

بھی وجود کے اُن ذرات میں کا ایک ذرہ ہی جو خدا کی طرف سے فائض ہوتے ہیں اسی جگہ سے تم اُن لوگوں کی غلطی کم فہمی اور رائے کی کمزوری کو معلوم کرلو جو عقل کو اس قسم کے معاملات میں سمعیات پر ترجیح دیتے ہیں۔

دوسرے مقام میں لکھتے ہیں۔

"وقد تنبه لذلك زعيمهم ابو علي ابن سينا فقال في كتاب المبدأ والمعاد ان المعاد الروحاني واحواله مما يتوصل اليه بالبراهين العقلية والمقائيس لانه على نسبة طبيعية محفوظة ووتيرة واحدة - فلنا في البراهين عليه سعة واما المعاد الجسماني واحواله فلا يمكن ادراكه بالبرهان لانه ليس على نسبة واحدة وقد بسطته لنا الشريعة الحقة المحمدية فلينظر فيها وليرجع في احواله اليها"[۲]

اور رئیس الفلاسفہ بو علی سینا نے بھی اس بات پر متنبہ ہو کر کتاب المبدء والمعاد میں یہ کہہ دیا ہی کہ روح کو عذاب و ثواب ہونے پر تو ہم دلائل اور قیاسات قایم کر سکتے ہیں کیونکہ ایسا ہونا مضبوط قانون طبیعی اور ایک خاص طریقے کے تحت میں داخل ہی تو اسکے اندر براہین سے ثابت کرنیکی گنجائش نکل سکتی ہی مگر جسمانی عادہ اور جزا سزا کا محض استدلال سے جاننا ہرگز ممکن نہیں کیونکہ وہ کسی خاص نسبتہ اور قاعدے کے نیچے واقع نہیں ہی لیکن شریعت محمدیہ حقہ نے اسکے حالات تفصیل کیسا بیان کر دیے ہیں جس کا جی چاہیے اُسکی طرف رجوع کرکے دیکھ لے

جو علوم نہ بذریعہ عقل کے بلکہ بذریعہ کشف کے معلوم ہوں اُن کی بابت کہتے ہیں۔

"ثم هذا الكشف لا يكون صحيحا كاملا عندهم الا اذا كان ناشيا عن الاستقامة"

پھر یہ کشف بھی صحیح اور کامل اسوقت تک نہیں ہوتا جبتک کہ استقامت (یعنی شریعت کے احکام پر پورا پورا عمل نہ ہو)

---

۱ دیکھو مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مصر صفحہ ۳۴۲ ۔ ۲ دیکھو مقدمہ ابن خلدون مصری صفحہ ۴۵۷

الکشف قد یحصل لصاحب الجوع
والخلوۃ وان لم یکن ھناک استقامۃ
کالسحرۃ والنصاریٰ وغیرھم من المرتاضین
ولیس مرادنا الا الکشف الناشی عن
الاستقامۃ ومثالہ ان المرأۃ الصقیلۃ
اذا کانت محدبۃ او مقعرۃ وحوذی بھا
جھۃ المرئی فانہ یتشکل فیھا معوجا
علی غیر صورتہ وان کانت مسطحۃ
تشکل فیھا المرئی صحیحا۔[۱]

ورنہ یوں تو بہت سے ریاضت اور خلوت سے صفائی قلب
حاصل کرنیوالوں کو بھی کشف ہونے لگتا ہے جیسا کہ
ساحرین نصاریٰ اور ریاضت کرنیوالے اور ان
دونوں کی مثال ایسی سمجھو کہ ایک صاف آئینہ تو
محدب اور مقعر (اونچا نیچا) ہو اس میں کسی چیز کا
عکس بھی ٹیڑھا ترچھا پڑتا ہے اور ایک آئینہ مسطح (ہموار)
ہو اس میں شکل بھی سیدھی اور صحیح صحیح
دکھائی دے گی۔

حضرت شیخ شہاب الدین صاحب سہروردی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں۔ کہ:۔
"عقل اور استدلال کے طریقے سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ ایسا یقینی نہیں ہوتا جس کا ازالہ نہ ہو سکے" تو گویا اس میں ایک قسم کا تردد اور اضطراب رہتا ہے اور صوفیا کرام کے علوم بالکل قطعی اور یقینی ہوتے ہیں یعنی ناپائدار نہیں ہوتے اُن میں اگر کوئی شک و شبہ پیدا کرنا چاہے تو ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو ایسا ہے کہ گویا اپنی آنکھوں سے ایک چیز دیکھ لی اور اپنے کانوں سے کوئی بات سُن لی چنانچہ عوارف میں لکھتے ہیں:۔

فما اضطراب الطبائع الا ضرب
من الجھل فقلوب الصوفیۃ واعیۃ
لانھم زھدوا فی الدنیا بعد ان

تو یہ اضطراب اور تردد جو طبیعتوں میں دیکھتے ہو یہ بھی
جہل کی ایک قسم ہے اس اعتبار سے صوفیوں کے
قلوب سنتے محفوظ ہوتے ہیں کیونکہ انھوں نے تقویٰ

[۱] دیکھو ایک مقدمہ ابن خلدون مصری صفحہ ۳۹۲ ۱۲

احکموا اساس التقوی فبالتقوی زکت اور طہارت کی بنیاد کو مضبوط کرکے زہد اور ترک دنیا اختیار
نفوسھم وبالزھد صفت قلوبھم کیا تو تقوی کی وجہ سے ان کے نفس پاک اور زہد کی
فلما عدموا شواغل الدنیا بتحقیق وجہ سے دل صاف ہو گئے اور جب دنیوی مشاغل کو
الزھد انفتحت مسام بواطنھم انھوں نے فنا کردیا تو اُن کے باطن کے مسامات کھل
وسمعت آذان قلوبھم۔ [1] گئے اور اُن کے دل کے کان سُننے لگے۔

متکلمین کی جماعت میں علامہ علاؤالدین علی الطوسی (المتوفی ۸۸۷ھ) نے سلطان محمد فاتح کے حکم سے جو کتاب حکمار کے رد میں لکھی ہے اس کے مقدمہ میں یہ بتلایا ہے کہ ہماری عقل بہت سی اشیاء کی حقیقت دریافت کرنے سے قاصر رہتی ہے بلکہ بڑے بڑے حکماء محسوسات کی ماہیت معلوم کرنے سے عاجز ہو جاتے ہیں تو ہمکو چند ایسے امور کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہیے جنکی باریکیوں کو اگرچہ ہم نے خود نہیں سمجھا مگر خدا کی ایسے سچے رسولوں نے ہمکو اُن کی خبر دی ہے جن کی صداقت پر سینکڑوں آیات بینات گواہی دے رہی ہیں۔

کیا ہماری آنکھوں نے اُن تمام چیزوں کو دیکھ لیا ہے جن کو وہ دیکھ سکتی ہیں یا ہمارے کانوں نے اُن تمام آوازوں کو سُن لیا ہے جن کو وہ سُن سکتے ہیں یا ہمارے ہاتھوں نے تمام اُن چیزوں کو چھو لیا ہے جن کو وہ چھو سکتے ہیں یا ہماری زبان نے تمام اُن الفاظ کو ادا کر دیا ہے جن کو ہم ادا کر سکتے ہیں) پھر جب ہمارے ان حواس اور ان قوتوں نے اپنے مقدورات پر پورا پورا احاطہ نہیں کیا تو کیا وجہ ہے کہ ہماری عقلی قوت کو اپنی ساری معلومات پر کامل تصرف اور قبضہ حاصل ہو جائے یہاں تک کہ خدا کی ذات و صفات کے مسائل بھی اس

---

[1] دیکھو عوارف المعارف مطبوعہ مصر صفحہ ۱۲۶ ۶ ۶ ۶ ۶ ۶ ۶ ۶ ۶ ۶ ۶

کے قابو میں آجائیں اور حقائق اشیا میں سے کوئی حقیقت ایسی نہ رہے جو اسکی دسترس سے اچھوتی ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پانی آگ مٹی وغیرہ وہ اجسام جو ہر وقت ہمکو نظر آتے ہیں ان کی حقیقت کے دریافت کرنے میں بڑے بڑے فلاسفر متحیر ہیں افلاطون کہتا ہے کہ یہ بسیط اجسام ہیں اور ارسطو کی جماعت کہتی ہے کہ نہیں ہیولی اور صورت سے مرکب ہیں۔ ویمقراطیس کہتا ہے کہ یہ اجسام ایسے ذرات سے مرکب ہیں جو نہایت چھوٹے اور نہایت سخت ہونے کی وجہ سے قابل تقسیم نہیں ہیں۔ پھر اجزا جسم کے متناہی اور غیر متناہی ہونے کی حیثیت سے نظام کچھ کہتا ہے اور متکلمین کچھ اسی طرح عقل اور نفس ناطقہ کے بارے میں ہر ایک کا مذہب جدا گانہ ہے اور ایک جو دلیل قائم کرتا ہے دوسرا اُس کو رد کر دیتا ہے بھلا وہ نفس جو ہر وقت ہمارے پاس رہتا ہے اور وہ اجسام جو شب و روز ہمارے استعمال میں آتے ہیں جب ان کی حقیقت کے معلوم کرنے میں اذکیا کا یہ حال ہے تو غیب کے اسرار اور ملکوت کے دقائق تک ان کی رسائی کی کیونکر اُمید ہو سکتی ہے۔ سوا اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے صفات و افعال کی صحیح کیفیت کو وہ ہی شخص سمجھے جس کی تائید خدا کی جانب سے کیگئی ہو یا ایسا شخص اس کی اطلاع کرے جس کے مبعوث من اللہ ہونے پر ہزاروں علامات ظاہر ہو چکی ہوں ورنہ جو احمق نبوت کے انوار سے مستفید ہوئے بغیر محض اپنی عقل پر بھروسہ کر کے الہیات کی کنہ تک پہنچنا چاہے گا اُس کے اوہام یقیناً اس کی عقل سے سخت مزاحمت کرینگے اور اُس کو وہمی اور عقلی چیزوں کے تمیز دینے میں ایسی دشواری پیش آئیگی جسکے انسداد کی کوئی تدبیر اسکے پاس نہ ہوگی ارسطو کا یہ قول نہایت انصاف پر مبنی ہے کہ الہیات کے مسائل میں دلائل سے یقین کا مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا باقی جن حکما نے انبیا کی تقلید کو چھوڑ کر ان مسائل میں انہماک پیدا کیا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ خدا تعالیٰ نے ان کو فطرتاً ذہین بنایا تھا اور اُن کی عقلوں میں ایک قسم کی تیزی

پیدا کی تھی جس کے ذریعہ سے انہوں نے ہندسہ اور حساب وغیرہ علوم میں ایسی کامل دستگاہ پیدا کرلی کہ اس اعتبار سے اُن کی جس قدر تعظیم کیجاتی تھوڑی تھی لیکن افسوس اُنھوں نے خدا کے اس انعام کا شکریہ ادا نہیں کیا اور وہ اس کے پورے پورے مصداق بنگئے ع۔

اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی

انھوں نے ایسے دق و دق میدان میں قدم رکھنے کی جرأت کی کہ جو اُن کی فہم و فراست کی سرحد سے بالکل خارج تھا۔ یہاں تک کہ وہ خود بے راہ ہوئے اور اوروں کو گمراہ کیا۔

اب اُن کے اس حال سے ہر ایک انسان کو چاہئے کہ عبرت حاصل کرے اور کسی ایسی رسول کے اقوال پر جس کی راستبازی دلیلوں سے ثابت ہو چکی ہو بے چون وچرا اعتماد کرکے اپنے دل کو ان اضطرابات اور شکوک و اوہام سے رستگاری دے وَاللّٰہُ یَہْدِی مَنْ یَّشَاءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ؁

اب یہاں پہنچکر ہم کو چاہئے تھا کہ ہم قلم کی باگ امام غزالی کی تقریر کی طرف پھیر دیتے جس کا حوالہ ہم بہت دُور سے دیتے چلے آرہے ہیں کیونکہ اس وقت ہم حکماء اور متکلمین صوفیہ اور مورخین سب کے کلاموں کے انتخاب سے فارغ ہو چکے ہیں اور ہماری تحریر کے پڑھنے والوں میں جو تحریک اس مسئلہ کی بابت ہم پیدا کرنا چاہتے تھے وہ بھی غالباً پیدا ہو چکی ہے لیکن بڑی کوتاہی ہوگی اگر ہم اس موقع پر شاہ ولی اللہ صاحب جیسے یگانہ عصر کو فراموش کرجائیں جن کی نسبت مشہور ہے کہ متاخرین میں اُن سے بڑھکر کوئی اس مسئلہ (عقل و نقل) کا سمجھنے والا پیدا نہیں ہوا اور نہ اس آخیر دور میں اُن سے زیادہ کسی نے شریعت کے اسرار اس قدر تفصیل کیساتھ بیان کئے وہ اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ

۱؎ تفصیل کیلئے دیکھو ... مطبوعہ ... صفحہ ۱۰۹ ... ۱۲۰

قد يظن أن الاحكام الشرعية غير
متضمنة لشئ من المصالح وانه ليس
بين الاعمال وبين ما جعل الله جزاءً
لها مناسبة وان مثل التكليف بالشرائع
كمثل سيد اراد ان يختبر طاعة عبده
فامره برفع حجر او لمس شجر مما لا فائدة
فيه غير الاختبار فلما اطاع او عصى
جوزى بعمله وهذا الظن فاسد تكذبه[له]
السنة واجماع القرون المشهود
لها بالخير ۔

کبھی یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ شریعت کے احکام عقلی مصالح پر
مشتمل نہیں ہیں اور نہ اعمال میں اور ان کی پاداش میں کوئی
خاص مناسبت ملحوظ ہے اور یہ کہ انسان کو خدا کی جانب سے
احکام شرعیہ کا مکلف بنانا ایسا ہی جیسا کوئی آقا اپنے غلام کی
فرمانبرداری کا امتحان کرنا چاہے اور اس کو کسی پتھر کے اٹھا
لانے یا کسی درخت کے چھونے یا کسی اور ایسے کام کا حکم کرے
جس میں اس کی آزمائش کے سوا کوئی فائدہ نہ ہو اب اگر
اس غلام نے اطاعت کی یا نہ کی تو اس کو ویسا ہی بدلہ
دیدیا گیا۔ شریعت کی بابت یہ خیال بالکل فاسد ہے
جسکی تکذیب سنت رسول اللہ اور قرون اولیٰ کے اجماع نے کی ہے

پھر ایک ورق کے بعد یہ بھی لکھتے ہیں ۔

نعم كما اوجبت السنة هذه وانعقد
عليه الاجماع فقد وجبت ايضا
ان نزول القضاء بالايجاب والتحريم
سبب عظيم فى نفسه مع قطع النظر
عن تلك المصالح لاثابة المطيع و
عقاب العاصى وانه ليس الامر على
ما ظن من ان حسن الاعمال و

ہاں جیسا کہ سنت اور اجماع سے یہ ثابت ہوا اسی طرح یہ بھی
ثابت ہوا ہے کہ خدا کی طرف سے محض کسی چیز کے وجوب یا حرمت
وغیرہ کے متعلق حکم کا نازل ہونا بھی مصالح عقلیہ سے قطع نظر
کر کے نیکوں کو ثواب اور گنہگاروں کو عذاب دینے کا بڑا سبب ہے
اور ایسا نہیں جیسا کہ بعضوں کا گمان ہے کہ اعمال کا حسن و
قبح یعنی ان کے کرنے نہ کرنے پر عذاب و ثواب کا استحقاق
محض عقل سے ثابت ہو سکتا ہو باقی شریعت کا کام اس

له دیکھو حجۃ اللہ البالغہ مطبوعہ مصر صفحہ ۱۲۵ ۔

فیجہا بمعنی استحقاق العامل الثواب والعذاب عقلیان من کل وجہ وان الشرع وظیفتہ الاخبار عن خواص الاعمال علی ما ہی علیہ دون انشاء الایجاب والتحریم بمنزلۃ طبیب یصف خواص الادویۃ وانواع المرض فانہ ظن فاسد تمجہ السنۃ بادی الرای۔[1]

اُس طبیب کی طرح جو دواؤں کے خواص اور مرض کے اقسام کو بیان کرتا ہے صرف یہ ہو کہ وہ اعمال کی واقعی خاصیتوں کو ظاہر کر دے نہ یہ کہ وہ اپنی طرف سے کسی چیز کو واجب یا حرام بتائے اس قسم کے خیالات بالکل فاسد ہیں جن سے کھلے طور پر سُنّت رسول اللہ نفرت کرتی ہے۔

یہ تمام اقوال جو یہاں تک نقل کئے گئے اُن مستند علماؑ کے اقوال ہیں جو بلحاظ اپنے فضل و کمال کے اُمت محمدیہ کے آفتاب اور ماہتاب شمار کئے گئے ہیں اور جن کی فضیلت خواہ کسی حیثیت سے ہو چار دانگ عالم میں تسلیم کی جا چکی ہے۔

لیکن ان منفرق اقوال اور پراگندہ مضامین سے ایک کم علم آدمی بجائے اس کے کہ کچھ فائدہ اُٹھائے سخت پریشانی میں پڑ جاتا ہے اور وہ متعین نہیں کر سکتا کہ میں ان میں سے کس بات کو لوں اور کس کو چھوڑوں اسی تذبذب کے وقت میں امام غزالی آتے ہیں اور احیاء العلوم وغیرہ کے ذریعے سے اس کی دستگیری کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ گھبراؤ نہیں یہ سب باتیں درست ہیں یہ بھی صحیح ہے کہ کسی مذہب حق کے تمام احکام عقل کے مطابق ہیں اور یہ بھی ایک اعتبار سے صحیح ہے کہ نبوۃ اور ولایت کا مرتبہ عقل سے بالاتر ہے یہ بھی غلط نہیں کہ ہر ایک علم عقل ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے اور اس کہنے میں بھی کچھ حرج نہیں کہ بعض علوم عقل کے سوا اور کسی طریقے سے بھی حاصل ہو جاتے ہیں اُس کو بھی ہم تسلیم کرتے ہیں کہ شریعت نے تمام احکام

---

[1] دیکھو حجۃ اللہ البالغہ مطبوعہ مصر صفحہ ۱۲ ج ۱

عقلی مصالح پر مبنی ہیں اور یہ کہنا بھی بیجا نہیں کہ محض عقلی مصالح کسی چیز کے فرض کرنے یا حرام کرنے کیلئے کافی نہیں۔

ممکن ہے کہ تمہاری کمزور طبیعت ان متضاد بیانات کو دیکھکر گھبرا اُٹھے اور تم ان پیچیدار مقدمات کو کوئی منطقی طلسم سمجھنے لگو مگر جو جامع مانع تقریر ہم عنقریب درج کریں گے اس کو پڑھکر تمہاری تسلی ہو جائے گی اور تم یقین کر لوگے کہ ان اقوال میں لفظی نزاع کے سوا کوئی حقیقی اختلاف سمجھنا ہمارے فہم کی تقصیر ہے۔

تم سب سے پہلے اس پر غور کرو کہ انسان کو قدرت نے دوسرے حیوانات سے کون سی امتیازی حالت عطا کی ہے کیا قدرت۔ ارادہ۔ خوف۔ رجا۔ شہوۃ۔ غضب یہ صفات جو انسان میں رکھی ہوئی ہیں اور حیوانات میں نہیں ہیں یا آنکھ۔ ناک۔ کان۔ زبان۔ دست وپا جو اعضا انسان کو عنایت کئے گئے ہیں اوروں کو نہیں دیئے گئے یا حس مشترک خیال وہم۔ حافظ وغیرہ حواس باطنہ جو انسان میں ودیعت کئے گئے ہیں دوسروں کے حصہ میں نہیں آئے۔ تم یقیناً کہوگے کہ ان سب چیزوں کے اعتبار سے انسان کو کوئی فضیلت اور جانوروں پر حاصل نہیں ہے بلکہ بسا اوقات بعض جانور ان بعض قوتوں میں انسان سے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں تو پھر وہ کیا خصوصیت ہے جس کی وجہ سے انسان کی شرافت جانوروں کے مقابلہ میں تسلیم کر لی گئی اور وہ کیا علامات ہیں انسان کے روشن چہرہ کے امتیازی خط وخال ہیں۔

اس کے جواب میں ہم بجز اُن دو چیزوں کے کسی کا نام نہیں لے سکتے جن کا اختصار علم اور ارادہ کے دو چھوٹے چھوٹے لفظ کرتے ہیں اور جن کی تشریح میں ہمکو اپنے ناظرین کے وقت کا ایک معتد بہ حصہ لینا پڑیگا علم سے ہماری مراد وہ علم ہے کہ جس کی بدولت دُنیا

اور آخرۃ کے حالات منکشف ہوتے ہوں اور وہ کائنات کے حقائق کو اُن کی اصلی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہو۔ اور ارادہ کے لفظ سے ہم نے اُس ارادہ کا قصد کیا ہے جو نفسانی خواہش کے اشارہ پر نہیں بلکہ علم کے اشارہ پر چلنے والا ہے کیونکہ جو ارادہ قوۃ شہوانی کی تحریک سے پیدا ہوتا ہے وہ تو تمام حیوانات میں موجود ہے۔ ہر جاندار بھوک اور پیاس کیوقت دانہ پانی کی طلب میں دوڑتا ہے شہوۃ کے غلبہ کیوقت اُس کے فرو کرنیکا ارادہ کرتا ہے اپنے دشمن کے مقابلہ میں پوری طاقت اور زور آزمائی دکھلاتا ہے۔ تو کیا ان سب جانوروں میں ارادہ نہیں پایا گیا۔ لیکن ہاں وہ ارادہ نہیں جو افراد انسانی کی خصوصیات میں سے ہے انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شہوانی میلان کے خلاف بھی اگر اس کی عقل ہدایت کرے حرکت کر سکتا ہو۔ اور اپنے فعل و ترک میں جی چاہنے نہ چاہنے کا پابند نہو۔

یہ ارادہ اور وہ علم جس کا ذکر پہلے ہوا بزرگترین مخلوقات یعنی انسان کیساتھ مختص ہیں۔ اور ان ہی دو نشانیوں سے انسان حیوانات سے اور بڑا آدمی بچوں سے باعتبار اپنے کمال کے پہچانا جاتا ہے بچہ جب اپنی پیدائش کے مدارج طے کرتا ہوا رحم مادر سے باہر آتا ہے تو وہ نہ بھلے بُرے۔ نیک بد اور نافع مضر کی تمیز رکھتا ہے اور نہ اس کا کوئی ارادہ کسی قانون عقلی کا تابع ہوتا ہے اور جوں جوں اس کے قوی میں نشوونما۔ اس کے علم میں ترقی اس کی معلومات میں وسعت ہوتی جاتی ہے اُسی قدر اُس کے افعال و اعمال فہم و دانش کے قاعدوں میں منضبط ہوتے جاتے ہیں اب اگر اس کا علم سچا ہے اور اس کی عقل نے جو فتوے نافذ کئے ہیں وہ صحیح ہیں تو اُس کے سب عمل درست ہو سکتے ہیں اور اگر اس کی عقل نے لغزش کھائی۔ نافع کو مضر۔ مضر کو نافع یا نیک کو بد بد کو نیک سمجھ لیا تو ہرگز توقع نہیں کہ وہ اپنی حرکات و سکنات میں کج روی و غلطی سے محفوظ رہے اس صورت میں ہر انسان پر واجب ہے کہ وہ

صحیح علم کے حاصل ہونیکے ذرائع سوچے اور نا زیست اپنے اندر ان کے پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

لیکن جس حد تک غور کیا گیا علم کی حقیقت اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوئی کہ کسی چیز کا نقشہ ایسی طرح ہماری عقل میں کھنچ جائے جیسا کہ آئینے میں کسی شے کی تصویر نظر آنے لگتی ہے دیکھو اگر کوئی شخص ہماری نظر سے گذرا یا ایک شاندار مکان ہم نے کسی جگہ دیکھا اور کچھ دیر کے بعد ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو پھر ہم جب کبھی اُس شخص یا اُس مکان کو دیکھتے ہیں فوراً شناخت کر لیتے ہیں کہ یہ وہی شخص اور وہی مکان ہے اگر ہمارے پاس کوئی ایسا نقشہ جو اس مکان یا اس شخص پر پورا پورا منطبق ہو موجود نہ ہوتا تو وہ اور کونسا معیار تھا جس کے ذریعے سے اتنی مدت کے بعد ہم کو یہ شناخت ہو گئی اس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کا ذہن (عقل) مثل ایک آئینہ کے ہے اور اُس میں جو معلومات حاصل ہوتے ہیں وہ اُس عکس کی مانند ہیں جو کسی شے کے محاذات کے وقت آئینہ میں دکھائی دیتا ہے اتنا فرق ہے کہ آئینہ میں صرف اُن اشیاء کا عکس پڑتا ہے جو آنکھوں سے نظر آنے کے قابل ہوں اور ذہن میں ہر قسم کی چیزیں منتقش ہو جاتی ہیں۔ مثلاً کسی اسپیکر کی ایک لمبی چوڑی تقریر تم نے سُنی اور اُس کے مضامین کا خلاصہ تم نے اپنے ذہن میں ملحوظ رکھا تو اب جب کبھی کوئی شخص وہ تقریر کریگا تم فوراً سمجھ جاؤ گے کہ یہ بعینہ وہ مضامین ہیں جو فلاں اسپیکر نے بیان کئے تھے اگر اُن مضامین کا کوئی فوٹو تمہارے پاس نہیں تھا تو تم نے یہ کیسے جانا کہ وہ اور یہ تقریر ایک ہی ہے اس سے بدیہی طور پر معلوم ہوا کہ ہمارے ذہن میں ان مضامین کا کوئی خاکہ موجود تھا حالانکہ ان ہی مضامین کا عکس اگر ہم آئینہ میں لینا چاہیں تو بالکل ناممکن ہے۔

غرض آئینہ میں اور ذہن میں اتنا تفاوت ہے کہ ایک میں مخصوص چیزوں کا عکس آتا ہے۔

اور دوسرے میں ہر چیز کا مگر دونوں میں اس قدر اشتراک ہے کہ اُس میں بھی کسی چیز کی تصویر حاصل ہوتی ہے اور اس میں بھی اب اگر کوئی چیز آئینہ میں منعکس ہونیکے قابل ہو لیکن منعکس نہو تو جہانتک تتبع اور استقرار سے معلوم ہوا اس کے پانچ وجوہات ہو سکتے ہیں یا یہ کہ وہ جوہر رو ہا جس سے آئینہ بننا ہے اُس نے ابھی تک صیقل ہو کر آئینہ کی صورت اختیار نہیں کی۔ یا آئینہ بن چکا مگر زنگ آلود ہو گیا یا صاف وشفاف ہے مگر جس چیز کا عکس اس میں لینا چاہتے ہو وہ اُس کے مقابل نہیں۔ یا مقابل بھی ہے مگر آئینہ کے اور اُس شئی کے بیچ میں کوئی دوسری شئے حائل ہے یا عکس لینے والیکو یہ معلوم نہیں کہ اس صورت کا عکس کس جہت میں ہو کر لیا جا سکتا ہے ان سب حالتوں میں اشیاء مطلوبہ کا عکس آئینہ میں نہیں آسکتا اور اگر ان موانع میں سے کوئی مانع موجود نہو تو پھر محال ہے کہ محسوسات کی صورت اُس میں ظاہر نہ ہو۔

ٹھیک اسی طرح انسان کے قلب (عقل) کیحالت ہے کبھی تو ایسا ہو گا کہ خود قلب ابھی ناقص ہے اور انعکاس کی پوری قابلیت اس میں پیدا نہیں ہوئی جیساکہ شیر خوار بچہ کا قلب کہ وہ معقولات کے علم سے بالکل خالی ہوتا ہے اور کبھی معاصی اور ناپاک افعال کے ارتکاب سے قلب پر ایک قسم کی کدورت اور ظلمت چھا جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کی پوری جلا اور صفائی باقی نہیں رہتی اس لیے اس میں لطیف اور باریک چیزوں کا انعکاس نہیں ہوتا اور خدا کی ذات وصفات اور غیب کے اسرار سے یہ قلب بالکل عاری رہتا ہے اس قلب کے زنگ چھوڑانیکی اسکے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ وہ ہمہ تن خدا کی اطاعت کی طرف توجہ اور مقتضائے شہوات سے پورا پورا اعراض کرے اور مجاہدات کا وہ طریقہ اختیار کرے جو اس فن کے تجربہ کاروں نے ناجائز خواہشات کے استیصال کیواسطے تلقین

کیا ہے والذین جاھدوا فینا لنہدینہم سبلنا۔ اور من عمل بما علم ورثہ اللہ علم مالم یعلم میں اسی راز کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن کبھی آدمی کا قلب گناہوں کی آلائشوں سے پاک و صاف ہوتا ہے اور پھر بھی اس میں علوم ذات وصفات اور حقائق اشیاء مرتسم نہیں ہوتیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کی توجہ ان چیزوں کی طرف کامل نہیں ہوتی بلکہ وہ آفات نفس کے جاننے یا طرق معاش کے مہیا کرنے میں مثلاً مصروف ہوتا ہے تو وہ چیزیں جن کی طرف اسکے قلب کو توجہ نہیں ہے اسی طرح منعکس نہیں ہو سکتیں جس طرح آئینہ میں وہ صورتیں جو اس کے محاذی نہ ہوں ہاں قلب کبھی صاف بھی ہوتا ہے اور توجہ بھی کامل ہے مگر وہ فاسد عقائد جو تقلید یا حسن ظن کی بنا پر دل میں پہلے سے راسخ ہیں حقائق کے انعکاس کیلئے حجاب بنجاتے ہیں اور جیسا کہ اور شئے مطلوب کے درمیان میں اگر کوئی شئے حائل ہو جائے تو اس کا عکس اس میں نہیں پڑتا ایسے ہی حجاب کے وقت ہماری عقل حقیقی علوم کے حاصل کرنے سے قاصر رہتی ہے اور کبھی علم کے یہ تمام سامان جمع ہوتے ہیں مگر جن حاصل شدہ علوم پر یہ علم متفرع ہوتا ہے ان میں مناسبت ترتیب قائم کرنی ہمکو نہیں آتی اس لئے ہم علم سے محروم رہتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے۔ کہ ایک شخص اپنی گدی کے پیچھے کا حال آئینہ میں دیکھنا چاہے۔ اب اگر وہ آئینہ کو آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے تو پیچھے کا حال اس میں کھل نہیں سکتا اور اگر پیچھے لیجاتا ہے تو گو انعکاس ہو جاتا ہے مگر آنکھیں اس عکس کو دیکھ نہیں سکتیں۔

اس وقت یہ شخص باوجود تمام اسباب مہیا ہونیکے عکس کے دیکھنے سے اس لئے محروم ہے کہ اس کو اس عکس کے لینے کا طریقہ معلوم نہیں اگر کوئی اس کو یہ بتلادے کہ ایک آئینہ پیچھے لیجاؤ اور ایک آئینہ اس آئینہ کے محاذات میں اس طرح سامنے رکھو کہ جو عکس اس آئینہ میں پڑے

اُسی عکس کا پرتوہ دوسرے آئینہ میں بھی آجائے تو اس طریقہ کے معلوم ہونیسے اس کی ساری مشکل حل ہو جائیگی اور جو دقتیں اس عکس کے لینے میں وہ اُٹھار ہا تھا وہ یک لخت جاتی رہیں گی۔

یہی حال بعینہ انسان کے قلب کا سمجھو اور یقین کر لو کہ یہی امور ہیں جو اکثر حقائق کی معرفت سے ہمکو بے بہرہ رکھتے ہیں اگر یہ موانع نہوں تو بیشک ہر قلب اس فیض علم کے حاصل کر لینے کی پوری قابلیت رکھتا ہے۔ جو فیاض ازل کی طرف سے بغیر کسی بخل کے ہر وقت اور ہر آن جاری ہے۔

تو جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سچے مذہب کے احکام عقل کے مطابق ہوتے ہیں اُن کا یہ قول اس اعتبار سے بالکل صحیح ہے کہ ایک کامل اور صاف وشفاف عقل جس میں حقائق کے انعکاس کی سب شرائط موجود ہوں ہرگز خدا کے حکم کے خلاف حکم نافذ نہیں کر سکتی اور جنھوں نے یہ کہا ہے کہ احکام خداوندی کو اپنی عقل کی میزان میں نہ تولو اُن کی غرض یہ ہے کہ ہماری زنگ آلود عقلوں میں خدائی اسرار کا انعکاس نہیں ہو سکتا اسی طرح جس فریق کا یہ خیال ہے کہ حقائق نبوت اور حقائق صفات الٰہیہ ہماری فہم وادراک سے بالاتر ہیں وہ عام فہم اور ادراک کے لحاظ سے بالکل سچ کہتے ہیں اور جس شخص کا یہ قول ہے کہ نہیں یہ چیزیں بھی بذریعہ عقل انسانی کے دریافت ہو سکتی ہیں تو اس کا مدعی بھی غلط نہیں ہے وہ بجا طور پر عقل انسانی اسی کو قرار دیتا ہے جس میں نفسانی کدورتیں اور آلائشیں نہوں۔

غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ لوگ درجات عقل کے موافق جنت میں جائینگے اس پر محمول ہے کہ حقیقی عقل کو جس قدر ترقی ہوگی جنت کے دروازوں سے قرب ہوتا جائیگا اور یہ مقولہ کہ اکثر اہل جنت بے عقل ہوں گے اس میں وہ لوگ مراد ہیں جو دُنیا کے کاموں میں متوجہ نہونگی وجہ سے ابلہ سمجھے جاتے ہیں اور علیکم بدین العجائز کا خطاب

بھی انہیں سے ہی جن کے دماغ دقیق اسرار کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

اب تم ایکدفعہ اُن متعارض اقوال کو یاد کرو جن کے سُلجھانے میں تم سخت پریشان تھے اور جن کی کوئی درست توجیہ تم سے بن نہ پڑتی تھی اور آخیر میں امام صاحب کی اس زرّین نصیحت کو خوب یاد رکھو۔ کہ نہ عقل کو نقل سے استغنا اور نہ عقل نقل سے بے نیاز ہے

فلا غنا بالعقل عن السماع ولا غنا بالسماع عن العقل فالداعی الی محض التقلید مع عزل العقل بالکلیة جاهل والمکتفی بمجرد العقل عن انوار القرآن والسنة مغرور فایاک ان تکون من الفریقین وکن جامعا بین الاصلین فان العلوم العقلیة کالاغذیة والعلوم الشرعیة کالادویة والشخص المریض یستضر بالغذاء متی فاته الدواء فکذلک امراض القلوب لا یمکن علاجها الا بالادویة المستفادة من الشریعة وهی وظائف العبادات والاعمال التی رکبها الانبیا صلوات الله علیهم لاصلاح القلوب فمن لا یداوی قلبه المریض بمعالجات العبادة الشرعیة واکتفی بالعلوم العقلیة

جیساکہ عقل کو معزول کرکے محض تقلید کی طرف بلانے والا جاہل ہے اسی طرح وہ شخص بھی دھوکہ میں ہے جو قرآن و سُنّت کے انوار سے علیحدہ ہو کر صرف اپنی عقل پر بھروسہ کرے تو تمکو ان دونوں گروہوں میں سے کسی میں بھی داخل نہ ہونا چاہیے بلکہ عقل و نقل کا جامع بننا چاہیے کیونکہ علوم عقلیہ عقل کی غذا اور علوم شرعیہ اس کی دوا ہیں اور جو مریض دوا کا استعمال نہ کرے اُس کو غذا کے استعمال سے نقصان پہونچ جاتا ہے۔ یہی حالت دل کے امراض کی ہے کہ اُن کا علاج شرعی دواؤں سے یعنی اُن عبادات اور اعمال سے ہی ہو سکتا ہے جن کو انبیا علیہم السّلام نے اس کام کیلیے ترکیب دیا ہے پس جس کا دل بیمار اور وہ طب شرعی کے بموجب اس کا معالجہ بھی نکرے اور علوم عقلیہ کو اپنے حق میں کافی سمجھے وہ اسی طرح ہلاک ہوگا جس طرح بیمار آدمی غذا سے ہلاک ہو جاتا ہے باقی جو لوگ سچے علوم عقلیہ کو

استنصر بھا کما یستضر المریض بالغذاء علوم شرعیہ کے خلاف تصور کرتے ہیں اور دونوں

وظن من یظن ان العلوم العقلیۃ مناقضۃ میں تطبیق کو محال سمجھتے ہیں یہ اُن کا خیال اس

للعلوم الشرعیۃ وان الجمع بینھا غیر ممکن وجہ سے ہے کہ اُن کی بصیرت کی آنکھیں اندھی

ظن صادر عن عمی فی عین البصیرۃ۔ ہیں۔

نعوذ باللہ منہ۔ (خدا کی پناہ)

یہاں تک ہم نے امام غزالیؒ کی تقریر کا ماحصل نقل کر دیا۔ امام صاحب کی تقریر اگرچہ نہایت صاف نہایت سلیس۔ نہایت عام فہم اور نہایت پر اسرار ہے لیکن اس میں چند ایسے اقناعی مقدمات بھی ہیں جن کا انکار کر دینا ہمارے ایک بیباک حریف سے کچھ مستبعد نہیں ہے۔

ہم امام صاحب کے اس قابل قدر بیان کی بہت کچھ عزت کر سکتے ہیں لیکن ہمارا ایک ظاہر پرست اور آزاد منش مقابل اس پر یہ نکتہ چینی کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر ہم ذہن میں صورتوں کا انعکاس تسلیم کر لیں تو جو شرائط آئینہ میں انعکاس کیواسطے قرار دی گئی ہیں اُن سب کا ذہن میں پایا جانا کیوں ضروری ہے ہم نے مانا کہ ذہن میں اور آئینہ میں ایک حد تک مشابہت پائی جاتی ہے مگر ان دونوں میں تفاوت بھی بے انتہا ہے جس کا اعتراف تم بھی پہلے کر چکے ہو۔ اب اگر ان تفاوت کی بنا پر بعض وہ شرطیں جو آئینہ میں ضروری ہیں حصول علم میں ضروری نہ ہوں یا اس کے برعکس تو کیا مضائقہ ہے۔

اس کے سوا یہ بھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ اعمال بد کی مباشرت یا گناہوں کے ارتکاب سے قلب پر کسی قسم کی تاریکی آجاتی ہے اوّل تو ہم اعمال کی تقسیم نیک وبد کی طرف تسلیم ہی نہیں کرتے دوسرے معاصی میں ملوث ہونا بیشک قوت عملیہ کے سست یا فاسد

ہونے کا نتیجہ ہی لیکن قوت علمیہ کا اس اثر بد سے متاثر ہونا بظاہر کوئی معنی نہیں رکھتا نیز بقول قاضی ابن رشد اندلسی کے قرآن پاک نے جا بجا قیاس اور نظر کے طریقوں پر متنبہ کیا ہی اور خود بھی مختلف مواقع میں استدلال سے کام لیا ہی پس اگر شریعت کے احکام عقول عامہ سے بالاتر تھے تو قرآن نے ہم سب کو عقل سے کام لینے اور غور و فکر کرنے کی طرف کیوں توجہ دلائی۔ اور بقول سر سیّد کے ہر ایک انسان کو ایسے احکام کا مکلّف بنانا کیونکر صحیح ہوا جو اس کی سمجھ سے باہر تھے حالانکہ انسان اپنے ذی عقل ہونے کی وجہ سے ہی تکلیف شرعی کا مستحق ہوا ہے

یہ اور اسی قسم کے اور شبہات ہیں جن کو سنکر ہم صرف اتنا ہی کہنا چاہتے ہیں کہ شعر

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست　　سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست

اور بپاس خاطر معترض امام صاحب کے جادہ استدلال سے ہٹ کر با آگے بڑھکر اس زبردست فاضل کی تقریر کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کی تصنیفات میں جتنا غور کرو وتنا ہی اس کی وہبی دانشمندی اور صادق البیانی کا اعتراف لازم ہی یہ وہ فاضل ہی کہ جسکو اگر ہم اپنے عہد کا شیخ اکبر امام غزالی اور شاہ ولی اللہ سب کچھ کہدیں تو بیجا نہیں اور یہی وہ فاضل ہی جس نے علم کلام کی ایک ایسے انوکھے طرز میں بناڈالی جو (انشاء اللہ) قیامت تک کیواسطے پتھر کی لکیر ہی اور جس پر ہمارا ناز کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔

اس فاضل نے جس کو عام طور پر مولانا **محمد قاسم** صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہی اپنی مختلف کتابوں میں جو مفید بیانات درج کئے ہیں وہ اس مسئلہ عقل نقل میں ہماری بہت زیادہ مشکلکشائی کرتے ہیں اور اب ہم ذیل میں جو کچھ لکھینگے وہ تمامتر انہی تصانیف سے ماخوذ ہوگا۔ شعر

مطرب ترانۂ دگر از پردہ ساز کن　　زیرا کہ حرف عشق نمید ارد انتہا

صحیفۂ عالم کا وسیع مطالعہ کرنے سے یہ بات بخوبی روشن ہو چکی ہے کہ (بقول طبیعین کی فطرت نے اور بخیال اہل مذاہب کے) خدائے مختار نے دنیا کی کوئی چیز بیکار نہیں بنائی - اور جوں جوں تحقیقات کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے ووں ووں ہر ایک چھوٹی بڑی چیز کے منافع ہم پر ظاہر ہوتے جاتے ہیں اس لحاظ سے کائنات کا ہر جز و بیش قیمت حکمتوں کا مجموعہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہر شے کا تعلق کسی نہ کسی ایسی ایک یا چند اغراض سے بھی ہوتا ہے جنکی کمی زیادتی پر اس شے کا کمال اور نقصان منحصر ہے اور جنکو ہم اس شے کے اصلی اغراض کہہ سکتے ہیں مثلاً حیوانات میں گھوڑے کی مدح وذم اور اس کا حسن و قبح رفتار پر موقوف ہے اگرچہ وہ گدہے کی طرح پالان بھی اٹھا سکتا ہے اور گائے بکری کی طرح اس کو ذبح کرکے کھا بھی سکتے ہیں اور اس کا دودھ بھی پی سکتے ہیں لیکن یہ اس کے دودھ کی افراط یا بدن کی فربہی یا بار برداری کی طاقت اس کی قدر و قیمت میں اسی طرح کچھ زیادہ دخیل نہیں جس طرح گائے اور بھینس میں چونکہ مقصود اعظم دودھ گھی وغیرہ ہے اس لئے ان کی تیز رفتاری اور قدم بازی کا کوئی اثر ان کی بھلائی برائی پر نہیں پڑتا یا گلاب کے پھول کی حسن و خوبی اس کے رنگ و خوشبو سے ہے ذائقہ سے کچھ بھی غرض نہیں ہوتی یا آنب کے ذائقہ سے سروکار ہے اس کے رنگ اور خوشبو سے چنداں تعرض نہیں کیا جاتا ایسے ہی کتاب سے اگرچہ ہم کسی وقت تکیہ کا کام لے سکتے ہیں لیکن غرض اصلی اس سے پڑھنا ہی ہوتا ہے یا ضرورت کے وقت کپڑوں کو جلا کر کھانا پکا سکتے ہیں مگر اہم مقصد ان سے یہی ہے کہ وہ آدمی کے بدن کی پردہ پوشی اور زینت کا سبب بنیں -

غرض عالم کے تمام اجزا پر نظر ڈالی جائے ہر موقعہ پر یہی شان نظر آئے گی پھر یہ ناممکن ہے کہ انسان جو ہمیشہ اپنے اشرف المخلوقات ہونیکا دعوی کیا کرتا ہے کسی ایسی غرض اعلی اور

مطلب اعظم سے خالی ہو جس کی ہونے نہ ہونے پر اس کی بھلائی برائی موقوف ہو اور جس کے ذریعہ سے وہ مدح وستائش یا ہجو ومذمت کا مستحق سمجھا جائے۔

بیشک اس مقصد اعظم کے متعین کرنے میں ہمکو سخت دشواری پیش آئیگی لیکن ہم اس عقدہ کو خود اعضائے انسان کی بناوٹ اور اس کے قویٰ کی ترکیب سے حل کرینگے اور ہم یقین کرتے ہیں کہ خود انسان زبان حال سے اس مقصد کی جستجو میں ہماری رہنمائی کرے گا۔

ہم جب اس معجون مرکب (انسان) کی اندرونی وبیرونی حالتوں میں غور کرتے ہیں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان پانچ چیزوں سے اس کی ترکیب عمل میں آئی ہے عقل یعنی قوۂ علمیہ شوق یا خوف ارادہ اور اختیار۔ قدرت اور طاقت۔ ہاتھ پاؤں آنکھ ناک وغیرہ اعضائے جسمانی چنانچہ جس قدر کام انسان کرتا ہے اُن میں یہ پانچوں آلات اپنا اپنا عمل کرتے ہیں۔

فرض کرو کہ ایک شخص شب کے وقت ایک جنگل میں چلا جا رہا ہے اُس نے دور سے اپنے راستہ پر کسی جانور کو دیکھا جس کی نسبت کبھی تو اس کا خیال ہوتا ہے کہ یہ شیر ہے اور کبھی سمجھتا ہے کہ کوئی بیل کھڑا ہے اب فطرۃً انسان کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنے نفع اور ضرر کے پہلوؤں کو سوچے اگر اس پر ضرر کا پہلو متعین ہو گیا یعنی یہ کہ پھاڑ کھانیوالا شیر ہی تو طبعاً اس پر ایک قسم کے خوف یا اجتناب کی کیفیت طاری ہوگی اور اس کی وجہ سے وہ وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کریگا اور اس ارادہ سے اس کی قدرت اور طاقت تحریک میں آئے گی اور اگر اعضائے جسمانی قابو میں ہوئے تو اُلٹے پاؤں وہاں سے بھاگنا شروع کر دیگا اور اگر یہ شخص اس جانور کو شیر نہ سمجھتا یا شیر سمجھکر ایذا پہنچانیوالی چیز نہ تصور کرتا تو برابر اپنے شوق میں اُدھر بڑھا چلا جاتا۔

اس سے یہ امر بدیہی طور پر ثابت ہوا کہ شوق اور خوف ارادہ اور اختیار طاقت اور قدرت

ہاتھ اور پاؤں وغیرہ جن کے مجموعہ کو ہم قوت عملیہ سے تعبیر کرتے ہیں سب کے سب عقل یعنی قوۃ علمیہ کے محکوم اور زیر فرمان ہیں اور جب عقل مفرد (قوۃ علمیہ) کا کام نافع و مضر کی شناخت یا نیک و بد کی تمیز اور قوت عملیہ کا کام حسب اشارۂ عقل کسی عمل کا وجود میں لانا ٹھہرا تو اول کی حکومت اور دوسرے کی محکومی کے لحاظ سے ان دونوں کے مجموعہ یعنی انسان کا کل کام یہ ہوا کہ وہ سوچ سمجھ کر مفید مشاغل میں پڑے اور مضر کاموں سے بچے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہی جبکہ دنیا میں اعمال کی تقسیم نیک و بد یا نافع و مضر کی طرف ہو سکتی ہو کیونکہ اگر عملی دنیا سے بھلے برے کا فرق بالکل اٹھا دیا جائے تو قوۃ علمیہ کے کارناموں کیلئے کوئی میدان ہاتھ نہ آیگا جیسا کہ ہم ابھی بتلا چکے ہیں کہ قوت علمیہ صرف یہی کام کر سکتی ہی کہ مفید اور بہتر کاموں کا ناقص اور مضر کاموں سے انتخاب کرتے رہے اور قوت علمیہ کی اس کارگزاری کے لئے دو قسم کے اعمال کا اس کے سامنے پیش ہونا ضروری ہی

اب چونکہ یہ ثابت ہو گیا کہ اعمال کی دو قسمیں کئے بغیر انسان کی خلقت ہی بیکار رہتی ہی تو اس کا بھی سراغ نکل آیا کہ تمام عالم ہمیشہ سے اس پر متفق کیوں ہی کہ اعمال دو طرح کے ہوتے ہیں۔ نیک اور بد یا دوسرے الفاظ میں نافع اور مضر یہانتک کہ جو ملحد کسی مذہب کے قائل نہیں وہ بھی افعال و اعمال کی اس بدیہی تفریق کو تسلیم کرتے ہیں۔

اب جو کچھ گفتگو باقی ہی وہ صرف اس میں ہی کہ اعمال میں نیک و بد اور نافع و مضر کی تعیین کس طور پر کیجائے یعنی یہ کس طرح معلوم ہو کہ یہ فعل اچھا ہی یا برا۔ اس سے راحت پہونچیگی۔ اس سے تکلیف۔ لیکن خوش قسمتی سے جو تقریر مرقوم ہوئی اس سے اس سوال کا جواب بھی کافی حد تک نکل آیا کیونکہ جب عقل یا قوۃ علمیہ اس لئے پیدا ہوئی ہی کہ وہ بھلے اور برے یا مفید اور مضر اعمال میں امتیاز قائم کیا کرے تو یقیناً قدرت نے اس میں اس امتیاز

صحیح کا ملکہ ودیعت کیا ہوگا اس وجہ سے یہی رائے مضبوط معلوم ہوتی ہو کہ عقل سلیم جس کام کا حکم کرے وہ نافع ہو اور جس سے وہ انکار یا گریز کرے اس میں کوئی مضرت ہو۔

یہاں سے اس کی بھی قوی امید ہوتی ہو کہ اگر خدا کی جانب سے بندوں کی ہدایت کیلئے کچھ احکام نازل ہوں (جن کے مجموعہ کو مذہب کہتے ہیں) تو وہ بھی ہو بہو عقل کیموافق ہوں ورنہ خدائے برتر کی دانائی اور متانت پر یہ الزام عائد ہوگا کہ اس نے عقل کو بھی ہمارے قوی پر حکومت عطا کی تاکہ وہ سب اس کے اشاروں پر کام کریں اور رسول کو بھی حاکم بنا کر بھیجا تاکہ اس کی اطاعت کیجائے اور ساتھ ہی دونوں کو متضاد بلکہ تناقص احکام بھی دیدیئے جن میں سے ایک کو قبول کرتے ہیں تو لازمی طور پر دوسرے سے سرتابی کرنی پڑتی ہو۔

غرض اب نہایت باوثوق طریقے سے یہ طے ہوگیا کہ سچا مذہب وہی ہو جو عقل سلیم کے مطابق ہو اور بقول قاضی ابن رشد کے ہر اس شخص کو جس کے پاس عقل سلیم موجود ہو اپنی عقل سے کام لینا اور نظر و فکر کے صحیح طریقوں میں غور کرنا چاہئے۔

اور بیشک تمام قرآن اور تمام احادیث کا یہی منشا ہو کہ وہ عقل کے دستور العمل کے موافق تعلیم دیں اور ہر انسان کی عقل جب تک کہ وہ گرد و پیش کے خیالات سے متاثر نہ ہو۔ اور جب تک کہ عقلی صحت کا زائل کر دینا والا کوئی مرض اس کو لاحق نہ ہو اُن ہی سچے اعمال کی ہدایت کریگی جن کے رواج دینے کے واسطے خدا کے صادق القول پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں۔

لیکن ان تمام مراحل کے بعد بھی ہمکو جس مرحلے کا طے کرنا ہنوز باقی ہو وہ یہ ہو کہ عقل کے ساتھ سلیم کی قید بڑھانے سے یہ شبہ ہوتا ہو کہ بعض عقلیں غیر سلیم بھی ہوتی ہیں اور جب سلیم

کے معنی تندرست کے قرار دیئے گئے ہیں تو غیر سلیم اُس عقل کو کہیں گے جو مریض اور بیمار ہو۔ تو یہ ہم ابھی تک نہیں سمجھ سکے کہ تندرست (سلیم) عقل کونسی ہے اور بیمار کونسی۔ آیا عقل کو بھی کوئی مرض لگ سکتا ہے اور اگر بالفرض لگ سکتا ہے تو اُس کا علاج کیا ہے اُس کیواسطے طبیب کون ہے اور اُس کے مرض کی علامات کیا ہیں۔

صرف یہی استفسارات ہیں جواب باقی رہ گئے اور ان ہی کے حل ہو جانے پر اس بحث کا خاتمہ بھی ہو سکتا ہے مگر آپ کو ان سوالات کا جواب سُننے سے پہلے چند مختصر امور کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

اوّل یہ کہ جو کام ایسے آلات کے ذریعے کیا جائے جن میں احساس اور ادراک نہ ہو تو اُس کام کا نفع نقصان اُن آلات کی طرف منسوب نہیں ہوتا بلکہ اُس شخص سے تعلق رکھتا ہے جو ان آلات سے یہ کام لینے والا ہے۔ مثلاً بڑھی کے کام میں بسولا آتا ہے اگر اُس کی دھار جھڑ جائے یا لکھنے میں کاتب کے قلم کی نوک ٹوٹ جائے تو یہ سب بڑھی اور کاتب کا نقصان سمجھا جائے گا۔ بسولہ اور قلم کے حق میں نہ کوئی نفع متصور ہے نہ نقصان۔ کیونکہ نفع نقصان کا وجود درحقیقت راحت اور تکلیف سے وابستہ ہے اور راحت و تکلیف کو وہی اشیا محسوس کر سکتے ہیں جن میں ادراک اور شعور ہو۔ بہرحال جب آلات کا نفع و ضرر اصل فاعل کا نفع و ضرر ٹھہرا تو قوائے عملیہ کے کاموں میں جو کچھ نفع یا نقصان ہوگا وہ فی الواقع عقل اور روح کا ہوگا کیونکہ ادراک و شعور عقل و روح ہی کا خاصہ ہے اور سب قوتیں اُس کے آگے بمنزلہ آلات کے ہیں جیسا کہ ہم ابھی تحقیق کر چکے ہیں۔

دوسری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ قوۃ عقلیہ اور قوۃ عملیہ کے مابین قدرت نے کچھ ایسا مستحکم رابطہ پیدا کیا ہے کہ ان میں ہر ایک کے آثار دوسرے تک متعدی ہوتے ہیں قوت عقلیہ کے

جو آثار قوۂ عملیہ میں ظاہر ہوتے ہیں کچھ تو وہی ہیں جنکا تعلق صفت حکومت سے ہے یعنی تمام قوی عملیہ کا بمقتضائے محکومیت عقل کے ایک اشارہ پر حرکت میں آجانا اور بعض آثار ایسے ہیں جن میں عقل کی اس حکومت کو کچھ بھی دخل نہیں جیسے غصّہ کے وقت چہرہ کا تمتمانا اور آنکھوں کا سُرخ ہو جانا یا خوف کیوقت جسم کا کانپنا اور رنگ کا اُڑ جانا۔ ان حالتوں میں جب کسی اشتعال انگیز یا ہیبت ناک چیز کا ادراک عقل کو ہوا تو فوراً بلا ارادہ اور بلا اختیار غصّہ یا خوف کے آثار جسم پر ظاہر ہو گئے۔ درآنحالیکہ حکومت کی حیثیت میں قصد اور اختیار کا پایا جانا ضروری تھا علیٰ ہذا القیاس قوۂ عملیہ کیطرف سے بھی جو اثر عقل و روح تک پہنچتا ہے دو طرح کا ہوتا ہے ایک تو وہی بلحاظ محکومیت اور آلہ بننے کے قوۂ عملیہ کے تمام منافع اور مضار کا عقل کیواسطے ثابت ہونا دوسرے بعض کیفیات بدنی سے عقل و روح کا بے اختیار کلفت یا راحت اُٹھانا۔ چنانچہ میل کچیل اور بول و براز سے جو کچھ نفیس طبعوں کو کدورت یا بخار درد سر وغیرہ میں کلفت یا بدن کی صفائی کی لذت اور عافیت میں راحت ہوتی ہے وہ سب اسی قسم میں داخل ہے۔ اب جانبین سے ان پنہانی تعلقات۔ تاثیر و تاثر اور فعل و انفعال کے سلسلہ کو۔ دیکھکر ہمکو قطعی طور پر یہ یقین ہو گیا کہ قوت عملیہ کے بعض اعمال قوۂ علیہ (یا عقل یا روح) کے حق میں مُفید اور بعض مضر ہونگے اور کوئی ایک فعل بھی قوت علیہ کا اس نفع و ضرر سے خالی نہو گا۔

پس اگر کوئی ایسا کامل آدمی جس کی رُوح کی صحت اور عقل کی سلامتی دلائل قویہ سے ثابت ہو چکی ہو اعمال کے حسن و قبح کے متعلق کچھ "فتویٰ" نافذ کرے اور ہم اپنی قوۂ عملیہ کی کارروائی اس کے خلاف پائیں تو ہمکو اطمینان کر لینا چاہئے کہ ہماری قوۂ عملیہ مضرت یا یا الفاظ دیگر مرض میں مُبتلا ہے اور اُسے تاثیر و تاثر کے قانون کے موافق جو قوۂ عملیہ اور عقل کے درمیان

ابھی ثابت ہو چکا ہی یہ کہنا پڑیگا کہ قوۂ علمیہ یعنی عقل بھی اپنی اصلی حالت پر نہیں ہی بلکہ بیماری میں پھنسی ہوئی ہی۔ کیونکہ اگر عقل تندرستی کی حالت میں ہوتی اور پوری قوۃ کے ساتھ صحیح احکام نافذ کرتی تو قوۂ عملیہ جو ہر طرح سے اس کی محکوم اور زبردست ہی ہرگز اس کی عدول حکمی نہیں کر سکتی تھی۔

اس سے بھی زیادہ ضعف اور اضمحلال عقل کا اُس وقت ظاہر ہوتا ہی جبکہ وہ خود بھی کسی عمل کے فوائد یا نقصانات سے واقف ہو اور شہوۃ کے غلبہ یا کسی نفع جزئی معجل سے متاثر ہو کر اپنے اصلی حکم کے خلاف قوت عملیہ سے عملدرآمد کرا دے۔ حتیٰ کہ عمل کی ممارست سے عقل ایسی پاگل بنجائے کہ اسی مرض کو صحت سمجھنے لگے۔ چنانچہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے حالات کا تتبع کرنیسے یہ ظاہر ہوتا ہی کہ اس میں اکثر افراد اس قسم کے روحانی امراض میں مُبتلا ہوتے ہیں۔

دُور کیوں جاتے ہو اپنے زمانہ ہی کا حال مشاہدہ کر لو کہ اکثر لوگ ایسی موٹی موٹی باتوں میں جنکے بھلے بُرے سے سب واقف ہیں جان بُوجھ کر خلاف عقل عملدرآمد رکھتے ہیں۔ اور خاص وہ امراض جو تپ دق کی طرح مریض کو بھی کم محسوس ہوتے ہیں ان کی تشخیص تو کوئی طبیب ہی کر سکے تو کر سکے۔ پھر اکثر ارواح کا یہ حال ہی کہ بچپن سے تا حیات ان علتوں میں گرفتار رہنے کی وجہ سے صحت کی لذّت سے آشنا ہی نہیں ہوتیں اور کینہ، حسد، بخل، تکبر، خودپسندی وغیرہ امراض سے قطع نظر کر کے وہ عام امراض جن کو وبائی امراض کہنا چاہئے نہایت کثرت سے وقوع میں آتے رہتے ہیں۔

جس قوم کو چاہئے دیکھ لیجئے کہ شادی۔ غمی اور سوائے ان کے اور معاملات میں ایسی ایسی قیود اور رسوم قبیحہ کے پابند ہیں کہ جن کے نقصانات کا دل و جان سے اقرار کیا جاتا ہی کہ

اسی طرح ہر فرقہ ایک جُدے ہی عقائد پر دل جمائے بیٹھا ہے۔ اگر ان سارے فرقوں میں سے کسی ایک کو بھی حق پر قرار دیں تب بھی اکثر لوگ تو باطل پر ہی نکلیں گے۔

پھر اکثر اقوام کی بعض عادتیں ایسی خلاف عقل ہیں کہ جن کی قباحت تمام اہل مذاہب کے نزدیک مسلّم ہے ہندوستان کے رانگھڑ گوجر اور افغانستان کے کوہستانیوں اور عرب کے بدّوؤں میں چوری اور قزاقی اس درجہ مروّج ہوئی ہے کہ رواج کی رو سے ان کے خیال میں بموجب طعن و تشنیع نہیں رہی طوائف کی قوم میں زنا کی اس درجہ ترقی ہے کہ معیوب ہونیکے بجائے اس کو اپنا ہنر سمجھنے لگیں۔ بنیوں کی بزدلی اور بخل ضرب المثل ہوگیا ہے اور دوسری بعض قوموں میں شراب نوشی بے پردگی اور ترک ناموس کی یہ نوبت پہنچی ہے کہ اس کے نتائج بد برابر دیکھتے ہیں مگر زبان پر نہیں لاتے۔ غرض مختصر لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ آوہ کا آوہ بگڑا ہوا ہے جس کی اصلاح کی توقع بھی بہت کم ہو سکتی ہے۔

ایسی ابتر حالت میں جبکہ کوئی عقل بھی (الّا ماشاء اللہ) مرض سے خالی نہیں ہے۔ مجدد صاحب رح نے اگر یہ فرمایا کہ نبوت کا راستہ عقل کے راستہ سے علیحدہ ہے تو ہمارے نزدیک بہت بجا فرمایا۔ کیونکہ بیمار کی طبیعت بسا اوقات ایسی اشیا کی طرف راغب ہوجاتی ہے جو اس کے لئے مضر ہیں اور ان چیزوں سے نفرت کرتی ہے جو فی الواقع اس کو طعام مرغوب ہیں۔ بخار والا اکثر کھانے پینے سے متنفر ہو جاتا ہے اور دُنبل کی کلکن یا خارش کی نوچ میں انسان اپنے بدن کی نوچنے اور کھال کے نوچنے پر بے اختیار مائل ہوتا ہے۔ لیکن وہ نفرت اور یہ رغبت دونوں بے محل ہیں جس کا باعث یہی مرض ہوا ہے۔

اب اگر مجدد صاحب یا اور کوئی عالم یہ حکم صادر فرما دیتے کہ مذہب مرغوبات عقل سلیم کے مجموعہ کا نام ہے (اور درحقیقت ہے بھی ایسا ہی) تو ان مریض عقلوں کیواسطے آزادی

یعنی مطلق العنانی کا اچھا خاصہ بہانہ ہاتھ آجاتا اور وہ ہرگز تندرست اور بیمار عقل میں تفریق قائم نہ رکھتیں جس سے دُنیا میں ایک فساد عظیم برپا ہو جاتا اور ہدایت کے بجائے گمراہی پھیلتی بہر حال جبکہ اس امر کا باور کر لینا بالکل آسان ہو گیا کہ اکثر انسانی عقلیں مُبتلا امراض ہیں کی وجہ سے اس پر قادر نہیں ہیں کہ وہ تیقّن اور اطمینان کیساتھ تمام اخلاق و اعمال میں نیک کو بد سے اور مفید کو مضر سے تمیز دیسکیں تو ناچار اس بارے میں کسی ایسے طبیب حاذق کی طرف رجوع کرنا ضروری قرار پایا جس کی رائے کبھی غلطی نہ کرتی ہو جو اپنے مریضوں پر پورا پورا رحم کھانے کے علاوہ تمام دواؤں کے خواص اور اوزان سے واقف ہو جسکو مختلف دواؤں اور غذاؤں کی تاثیرات کے باریک سے باریک فرق معلوم ہوں اور جس کی نظر موسموں کے اختلاف اور رُوح کی تراکیب پر کامل طور سے حاوی ہو۔

لیکن ایسا طبیب اُس حکیم علی الاطلاق کے سوا کوئی نظر نہیں آتا جس کے سہارے تمام عالم کی ہستی قائم ہے جس کی ذات ہر قسم کے عیوب اور امراض سے پاک ہے اور جس کے وجود اور کمالات کو عنقریب ایک مستقل رسالہ میں ہم روشن دلائل سے ثابت کریں گے۔

دُنیا میں جس قدر ہادی آئے جن مقدس بندوں نے اپنی نبوّت کا سکہ بٹھلایا جتنے سچّے شریعتوں کے تبلیغ کرنیوالے گذرے وہ سب کے سب اُسی حکیم مطلق کے مطب کے نسخہ نویس اور تربیت یافتہ تھے۔ اُنھوں نے ہمیشہ اُسی رُوحانی کالج کی اسناد فضیلت لوگوں کو دکھلائیں اور اُسی حکیم برحق کے عطا کئے ہوئے اعزازی تمغے اور نشانات پیش کئے تاکہ اللہ کی مخلوق ماہر طبیبوں کو اشتہاری حکیموں سے جُدا کر سکے۔ رہبر اور رہزن کے پہچاننے میں دھوکہ نہ لگے محافظوں کی جماعت پر لٹیروں کا اشتباہ نہ ہو۔

ہم جب نبوّت کی ضرورت اور نبی کے تعیین پر مبسوط بحث کرینگے اُسوقت اُن علامات کا

تفصیلاً ذکر کریں گے جن سے کسی خاص شخص کی نسبت یہ دریافت ہو سکے کہ وہ خدائی مدرسہ کا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دنیا میں حکیم علی الاطلاق کی نیابت کا واقعی مستحق ہے۔

مگر اس موقع پر نہایت اختصار کے ساتھ صرف اتنا دکھانا چاہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے فیوضات اخذ کرنے اور اس کے علوم و کمالات کا مظہر بننے کے واسطے انسان میں عادۃً کن شرائط کی ضرورت ہے یا بالفاظ دیگر حق تعالیٰ کے مدرسہ میں طب روحانی کا حصول کس استعداد پر موقوف ہے۔

بلا شبہ اس قسم کے عمیق مباحث میں دخل دینے کا ہم کو کچھ استحقاق نہیں ہے اور جس وادی میں ہم قدم زن ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں اسکو بآسانی قطع کر لینے کا خیال محض ہماری فکر کے خارج از حوصلہ بلند پروازی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لیکن اُس ناواقف مسافر کو راستہ کی مشکلات کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے جس کی دستگیری کیواسطے ایک اعلیٰ درجہ کا مبصر اور تجربہ کار ہادی موجود ہو۔

ہم پہلے بھی جن تیرہ و تاریک راہوں کو طے کر کے اس مقام تک پہنچے ہیں اُن میں کو گذرنا آسان نہ تھا اگر قاسمی تصنیفات ہمارے لئے مشعل راہ نہ ہوتیں اور اب بھی انشاء اللہ آپ دیکھیں گے کہ اُن ہی کی روشنی میں منزل پیش آمدہ کے مہالک و خطرات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم اپنے مقصد اعلیٰ پر صاف جا پہنچیں گے۔

وہ ذات بابرکات جس کی قوۃ قدسیہ نے شریعت صادقہ کے پیچ در پیچ اور نظری در نظری اسرار کو بھی بداہت کی حدود کے قریب لا رکھا ہے۔ اگرچہ وہ خود دنیا سے اٹھ گئے مگر اُن کی قیامت تک نہ مٹنے والی یادگاریں ہماری رہنمائی کے واسطے زندہ جاوید ہیں۔

اس میں ہرگز مبالغہ نہیں کہ اگر حضرت مولانا محمد قاسم (روحی و ارواحکم فداہ) کی بیش بہا

کتابوں پر میری دسترس نہ ہوتی تو میں ہرگز اس طرح کے نازک مسائل پر بخوف و خطر قلم اُٹھانے کی جرأت نہ کرسکتا۔ اس لئے یہ سخت احسان فراموشی اور خیانت متصور ہوگی کہ میں کسی ایسے مضمون کو اپنی طرف منسوب کرکے جو درحقیقت حضرت مولانا مرحوم کی تصانیف سے اخذ کیا گیا ہو اپنی غیر واقعی عظمت و تفوق کا ثبوت پیش کروں۔ میں اس سے زیادہ اپنے کو خوش قسمت اور فائز المرام بنانے کی تمنا نہیں رکھتا کہ مولانا کے عالی مضامین میرے پیرایہ بیان میں اس طرح ادا ہو جایا کریں کہ اُن کی تعبیر میرے مدّعا کیواسطے مفید اور صحیح ہو اور اپنے قصور فہم یا پریشانی تقریر کی وجہ سے دلائل کی تقریب ناتمام نہ رہے۔ چنانچہ اسوقت بھی جس بحث کا آغاز کیا جاتا ہے اس میں میرا صرف اسی قدر تصرف ہوگا۔

یہ بحث جس کی ابتدا سے آج ہماری تحریر کی دوبارہ ابتدا ہوئی ہے فی الحقیقت نبوّۃ کی بحث ہے اور ہمکو ہٹ دھرمی اور دھینگا دھینگی سے نہیں بلکہ محض حق پژوہی اور انصاف کے ساتھ یہ دکھانا ہے کہ وہ پرعظمت و جلال مفہوم جس کے لئے نبی۔ رسول پیغمبر وغیرہ الفاظ وضع کئے گئے ہیں کیا خارج میں واقعی طور پر اُس کے کچھ افراد موجود ہیں یا وہ بھی منجملہ اُن شاندار تخیلات کے ایک تخیل ہے جنکو مغلوب الوہم لوگوں کے دماغ فرصت اور تنہائی میں بیٹھکر اختراع کرتے ہیں
اس آخر احتمال کو سُنکر جس سے شان نبوّۃ میں سخت ملحدانہ گستاخی ہوتی ہے ہمکو اندیشہ ہے کہ شاید کوئی جوشیلے مسلمان ہمارے ایمان میں تردد پیدا کرکے ہم سے ہی نہ بگڑ بیٹھیں اس لئے ہم ایسے صاحبوں سے باادب عرض کرتے ہیں کہ وہ بجائے اس کے کہ اپنے قابل تعریف غصہ اور جوش کو ہم مسلمان ناقلین کے حق میں صرف کریں بہتر ہو کہ اُن مطلق العنان دہریوں کی سرکوبی کیواسطے استعمال فرمائیں جنکی زبان سے ما یھلکنا الا الدھر اور ان ھی الا حیاتنا الدنیا وغیرہ الفاظ قرآن کریم نقل کئے گئے ہیں اور جنکی ایک بڑی بھاری تعداد آجکل یورپ میں زبان

قال سے اور ہندوستان وغیرہ میں زبان حال سے یہ صدائیں لگا رہی ہے کہ خدا کا وجود محض ایک فرضی وجود ہے نبوۃ و رسالۃ صرع کی بیماری کے نام ہیں اعجاز و کرامات اگلے زمانہ کی نظر بندیوں کے افسانے ہیں اور وحی و الہام کی حقیقت دیوانوں کی بڑ سے کچھ زیادہ نہیں ہے۔

یہ لوگ صرف ایک عقل کے اور وہ بھی اپنی عقل کے مشورہ کو ماننا چاہتے ہیں اور اُن کے مذہب میں جادہ عقل سے ایک انچہ ادہر اُدہر ہٹنا کفر و شرک یا کم از کم گناہ کبیرہ کے برابر ہے ہر ایسا شخص جسکو کبھی کسی مشکل مسئلہ کے متعلق افہام و تفہیم کا موقع ملا ہوگا بشرطیکہ اُسکے بیوقوف منی طب کے مسلمات بھی بہت ہی تھوڑے سے ہوں اندازہ لگا سکتا ہے کہ ایک ایسی آزاد فرقہ کی بے قید شبہات سے جس کا ذکر اوپر ہوا عہدہ برآ ہونا کس قدر دشوار مرحلہ ہے اور یہ کہ ہمارے مولائے روح (فداہ ابی و امّی) نے ان لامذہبوں کے مقابلہ میں کس درجہ ثبات و استقلال اور معقولیت سے کام لیا ہے۔

مولانا کا اس آزاد گروہ سے صرف ایک سوال ہے وہ یہ کہ تمام مخلوقات میں نیک و بد کا تفاوت۔ بھلے بُرے کا فرق اور اعلیٰ ادنیٰ کے امتیازی مدارج جو ہماری تمہاری سب کی عقل نے قائم کر رکھے ہیں اس کا معیار اور پیمانہ عقل کے پاس کیا ہے عقل نے جمادات سے حیوانات کو کیوں اچھا بتلایا ہے اور تمام حیوانات کے اعتبار سے انسان کو کیوں سند فضیلت عطا کی ہے جہالت کے مقابلہ میں وہ علم کی ہمیشہ کیوں مداح رہا کرتی ہے اور ہمت و شجاعت کے کارناموں کو وہ جبن و نامردی کے برخلاف کیوں حسبِ سربلند رکھنا چاہتی ہے مختصر وجود کو عدم پر وجودیات کو عدمیات پر نیکو ہونے پر استغنا کو احتیاج پر اور راحت کو تکلیف پر کیوں ترجیح دیتی ہے وہ کونسا نمونہ اُس کے پاس ہے جسکے ساتھ متناسب و مشابہ ہونے اور

نہ ہونیکی وجہ سے وہ مخلوقات میں سے ہر ایک چیز کو بھلا یا بُرا بنا دینے کا استحقاق رکھتی ہے۔

اگر تم ایک اچکن کا کپڑا کسی ہشیار درزی کو قطع کرنے اور سینے کیلئے دو یا بازار جاکر کوئی عمدہ ٹوپی اور خوبصورت جوتی خریدنے کا ارادہ کرو تو بیشک تم ان سب چیزوں کی حسن وخوبی اور موزونیت وغیر موزونیت کو اپنی اُن آنکھوں سے دیکھ سکو گے جو قدرت کی طرف سے تمکو انہی کاموں کیلئے عنایت ہوتی ہیں لیکن اس دیکھنے کے اندر تمکو چند پیمانوں پر ان اشیاء کے مطابق کرنیکی ضرورت ہوگی مثلاً اچکن کو تم اپنے بدن پر پہنکر اور جوتی کو پاؤں میں ڈالکر اور ٹوپی کو سر پر کر دیکھو گے اگر ان میں سے کوئی چیز اپنے پیمانہ پر پوری نہ اُترے بلکہ ڈھیلی یا تنگ رہی تو تم اُس کو ناموزوں سمجھکر مسترد کردو گے اور اگر اتفاق سے کوئی چیز خاطر خواہ اپنی پیمانہ پر مطابق ہوگئی تو پھر خود خیال کر سکتے ہو کہ تم کہانتک اُس کی قدردانی کیلئے تیار ہو گے۔

ٹھیک اسی طرح عقل کے پاس بھی ہر نیک وبد کی تمیز کا کوئی پیمانہ اور بھلے بُرے کی شناخت کا کوئی معیار موجود ہونا چاہئے کہ جس پر منطبق ہونے اور نہونے سے وہ ہر ایک مخلوق کے حسن وقبح کے مراتب دریافت کر سکے۔

غالباً ہر عقل کے جذر فطرت میں جیساکہ ہم عنقریب ثابت کرینگے مخلوقات کے ماسوا ایک ایسی اعلیٰ ہستی کا ادراک موجود ہے جو عین وجود ہونیکی وجہ سے عدم ونیستی کا شائبہ اپنے اندر نہیں رکھتی اور اسی وجہ سے وہ ہر قسم کی احتیاجات سے بے نیاز ہے وہ حی ہے۔ عالم ہے۔ قادر ہے۔ متکلم ہے ارادہ اور اختیار رکھتا ہے غرض کہ تمامی عمدہ صفات کے جامع اور ہر طرح کے عیب وقصور سے بری ہے۔

اب جس حد تک عقل اپنی رسائی اور صفائی کے موافق کسی مخلوق کو اس ایک چیز سے مناسب پاتی ہے اُسی حد تک اُس کو اعلیٰ اور افضل جانتی ہے اور جو چیز اُس سے بعید المناسبتہ

ہوتی ہے وتنا ہی عقل اُس کو پستی کی جانب دھکیلتی جاتی ہے۔ مثلاً۔

وہ عقل کے مرتبہ شناسی کا معیار (جسکو دوسرے الفاظ میں ہم خدای عزوجل ہی کہتے ہیں) چونکہ وجود ہی وجود ہی عدم کا اُس میں اصلاً اختلاط نہیں اسی واسطے ہماری عقل موجودات کو ہمیشہ معدومات پر ترجیح دیتی ہے۔ پھر موجودات میں بھی جس شئے میں خدائی صفات کا کم و بیش ظہور دیکھتی ہے اُسی حیثیت سے اس کی تفوق کو اُن اشیاء کے مقابلہ میں تسلیم کرانے لگتی ہے جن میں وہ صفات نہ پائے جاتے ہوں۔

دیکھو چونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ خداوند کریم زندہ ہے بیجان نہیں اور اس باب میں ہم نے دیکھا کہ آدمی اور جانور خدا تعالیٰ سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔ مٹی۔ پانی۔ ہوا۔ آگ۔ شجر۔ حجر وغیرہ نہیں رکھتے تو ہم نے جان لیا کہ حیوانات کا رتبہ جمادات سے اونچا ہے اس کے بعد خیال کیا کہ خداوند کریم عالم ہے جاہل نہیں اور ہر انسان باقی جانداروں سے علم و عقل میں ممتاز ہے تو ثابت ہوا کہ انسان جملہ حیوانات میں اشرف و افضل ہے پھر انسان بھی علم و اخلاق اور احوال و اعمال میں متفاوت اور کم و بیش ہیں تو جو کوئی علم میں زیادہ ہو اور اخلاق مثل قدرت۔ سخاوت۔ حلم۔ عفو وغیرہ کے جو خدا تعالیٰ کے اخلاق ہیں رکھتا ہو وہ بلا شبہ اپنے اقران سے فائق شمار کیا جائیگا۔

بہرکیف جس چیز کو بھی عقل بھلا یا بُرا کہتی ہے اُس کو ابتداً یا بالآخر اُسے ایک نمونہ اور معیار پر مطابق کر کے دیکھتی ہے البتہ چونکہ باہم عقلوں میں تیزی اور صفائی اور توجہ کے اعتبار سے بے انتہا فرق ہے۔ اس لیئے اس مطابقت اور مناسبت کے معلوم کرنے میں بھی بےحد تفاوت ہونا چاہیئے۔

اب تم خیال کرو کہ دنیا کی سب چیزیں ارواح ہوں یا اجسام۔ اخلاق ہوں یا اعمال

معانی ہوں یا الفاظ۔ باوجودیکہ خدائے برتر سے ایک قسم کی مناسبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ سب کی اصل وہی خالق بے نیاز ہے اور سب کا وجود اسی کے وجود کا پرتوہ ہے۔ لیکن پھر بھی اس مناسبت میں مخلوقات کے اندر زمین و آسمان کا تفاوت ہے۔

ارواح کو بسبب اپنی لطافت کے جو قرب و مناسبت جناب باری عز اسمہٗ سے حاصل ہے وہ ہرگز اجسام کثیفہ کو نہیں اور اجسام میں بھی مثلاً آگ۔ ہوا سے لطیف ہے اور ہوا پانی سے اور پانی مٹی سے تو اسی ترتیب سے ان میں سے ہر ایک کو خدا تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ ایک طرح کا قرب و مناسبت حاصل ہوگا اور شاید اسی قرب و بعد کا اثر ہے کہ لطیف چیزوں سے باوجود اس نزاکت کے وہ کارہائے نمایاں بن پڑتے ہیں کہ کثیف سے ہرگز نہیں ہو سکتے برق ایک پلک جھپکنے میں آسمان سے زمین پر آتی اور پھر آسمان پر اُڑ جاتی ہے اور اس سرعت سیر و سفر میں پہاڑ بھی اگر سامنے آجائے تو اُس کی بھی ذرہ برابر حقیقت نہیں سمجھتی شعاع شمس و قمر کا یہ حال ہے کہ سرعت برق بھی اُس کے سامنے گرد ہے کہاں زمین کہاں چوتھا آسمان خیال کرتے ہوئے دیر لگتی ہے پر اُس کو یہاں تک آتے دیر نہیں لگتی۔

علیٰ ہذا القیاس اپنی نگاہ کو دیکھو اور آوازوں کی تیزروی اور خیال و گمان کی رسائی کو سوچو جتنی لطافت بڑھتی جائیگی اُسی قدر زور اور قدرت زیادہ ہوگی جس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ لطیف چیزیں اپنے قرب و مناسبت کی بدولت خدا تعالیٰ کے فیضان کمالات سے وہ حصّہ لیتی ہیں جو بعید المناسبت اشیاء کو نہیں ملسکتا اور اس کی نظیر ظاہر میں بالکل اس طرح ہے کہ شمع کا نور اُس کے آس پاس کی چیزوں کو بہت زیادہ منوّر کرتا ہے لیکن دُور کی چیزیں اُس سے اتنی روشن نہیں ہوتیں۔

پس اگر وہ اخلاق حمیدہ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات بابرکات میں موجود ہیں قلیل کثیر کسی

فردِ بشر کے نصیب ہو جائیں تو بیشک بہ نسبت اُن افراد کے جن میں یہ اخلاق نہیں اُس شخص کو حق تعالیٰ سے بمقدارِ مطابقت اخلاق کے قربِ رُوحانی ہوگا اور جو عنایات خاصہ خدائے کریم کی اُس کے حال پر مبذول ہوں گی اوروں کو میسّر نہ ہو سکیں گی۔

آپ عنقریب بوضاحت و تفصیل یہ معلوم کرینگے کہ جیسے زمین و آسمان میں چار طرف نور آفتاب کا ظہور ہے اور اُسی کے ذریعے سے آپ سُرخ و سفید کا امتیاز اور خوبصورت و بدصورت کا فرق قائم کرتے ہیں اور ہر صحن اور ہر روشندان ہر جگہ اور ہر مکان میں جدی جدی قطع سے وہی جلوہ گری کیے ہوئے ہے ایسے ہی تمام کائنات کا وجود خداوند حقیقی کے نورِ وجود کی پرتوہ افشانی کا نتیجہ ہے۔ تو جس طرح آفتاب عالمتاب کو با ایں ہمہ عمومِ فیض قلعی دار آئینہ اور آتشی شیشے کے ساتھ وہ خصوصیت خاصہ حاصل ہے کہ دوسرے اجسام کے ساتھ نہیں۔

(دیکھو۔ آتشی شیشے میں سوائے روشنی کے آفتاب کی جانب سے ایک خاص حرارت اور آتشی اثر کی بھی آمد ہے اور باقی اجسام کو جو ہیں اُس کے پاس ہی رکھے ہوں اس تاثیر کی مطلق خبر نہیں۔ یا آئینہ قلعی دار میں آفتاب کی روشنی کا اس قدر اظہار ہے کہ درصورتیکہ دوسرے اجسام آفتاب سے فیضیاب ہو کر خود ہی روشن ہو جاتے ہیں یہ خود بھی سورج کی طرح چمک اُٹھتا ہے اور جو اجسام اس کے بالمقابل ہوں اُنپر بھی اپنا پرتوہ ڈالتا ہے۔)

اسی طرح فیض خداوندی کو بھی عام و خاص سمجھنا چاہیئے کہ یہ فرق بجز فرق مناسبت اور فرق قابلیت کے اور کیا ہوگا ورنہ ظاہر ہے کہ جیسے آفتاب کو آئینہ یا پتھر سب برابر و یکساں ہیں ایسے ہی خدائے بے نیاز کو بھی تمام مخلوقات برابر ہیں کسی سے بخل نہیں۔ البتہ مخلوقات کی قابلیت اور مناسبت بے انتہا مختلف ہے۔

تو جو لوگ صاف باطن ہیں اور اپنے بنی نوع سے ایسے ممتاز ہیں جیسے آئینہ لوہے سے

یعنی جیسے آئینہ دراصل وہی لوہا ہے جو میل کچیل کے دُور ہو جانیکے باعث صاف و شفاف
آئینہ بنگیا ہے ایسے ہی وہ لوگ بھی مثل اور بنی آدم کے وہ ہی حقیقت اور رُوح انسانی رکھتے
ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ اُن کی ارواح بوجہ نہونے آلایشوں اور کدورتوں کے جو بسبب تعلقات
جسمانی کے ہوتی ہیں پاک و صاف ہیں وہ لوگ عجب نہیں کہ بہ نسبت اپنے بنی نوع کے زیادہ
معزز و ممتاز ہوں اور بعضے ایسے فیض اُن کو خدا کی طرف سے پہنچتے ہوں کہ ہم کو تمکو
اُن کی اطلاع بھی نہو یعنی ہم تم بذات خود اُن فیوضات سے محروم رہیں گو اُن ہی پاکدل
لوگوں کے واسطہ سے جن کے قلوب پر اوّل وہ فیض وارد ہوتے ہیں صرف اس قدر
بہرہ یاب ہو جائیں جس قدر در و دیوار آئینہ منور سے یا سیاہ و سبز وغیرہ اشیار
جو جلنے کے قابل ہوں آتشی شیشے سے۔

غرض ہو سکتا ہے کہ جیسے آفتاب کے مقابلہ کے وقت آتشی شیشہ یا آئینہ قلعی دار کے باطن
میں آفتاب کی طرف سے ایک فیض ایسی طرح آتا ہے کہ بظاہر آتا ہوا کچھ معلوم نہیں ہوتا اور
پھر اُس کے حاصل ہو جانے کے بعد وہ دونوں بھی بقدر طاقت اپنی فیض رسانی میں
مطلق بخل و دریغ روا نہیں رکھتے بلکہ ہر اُس چیز کو جو اُن کے سامنے آتی ہے اپنے حلقہ اثر
میں داخل کرنے کے واسطے تیار رہتے ہیں۔

ایسے ہی کیا عجب ہے کہ بعض بنی آدم کے دلوں پر جنکے دل جسمانی کثافتوں اور نفسانی کدورتوں
سے پاک و صاف ہیں ایسی حرارت محبّت خداوندی نازل ہوتی ہو کہ اوروں کو اس کی خبر
بھی نہو اور وہ خود آتشی شیشے کی مانند اُس کو پی جائیں اور تحمل کر جائیں لیکن دوسروں کے
دلوں میں آگ لگا کر اور اُن کی ساری کدورتوں کو سوخت کر کے ایسا پاک و صاف کر دیں
جیسا لوہے کو جلا کر صاف و شفاف آئینہ بنا لیا جاتا ہے اور پھر اُس نور الٰہی سے جو مثل آئینہ

کے خاص اُن کے دلوں پر اُترتا ہے اور اُترتا ہوا معلوم نہیں ہوتا اور اُن کا ظاہر مثل در و دیوار کے اور باطن مثل اُس آئینہ کے جو خود آفتاب کے مقابل نہ ہو مگر اُس آئینہ کے مقابل ہو جو آفتاب کے مقابل ہی بکمال آب و تاب جگمگا اُٹھے۔ یعنی اُن کا فیض اُن لوگوں کو جو اُن کی طرف صدق دل سے متوجہ ہوتے ہیں ظاہر و باطن میں ایسا مالامال کر دے کہ کدورت کا نام و نشان باقی نہ رکھے اور عمدہ اعمال اور برگزیدہ اخلاق سے اُن کا اندرون و بیرون بخوبی آراستہ ہو جائے۔

ہماری خواہش اس وقت اپنے دوستوں سے اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدائے عزوجل میں (جو کہ مخزن کمالات ہے) اور چند انسانوں میں فقط ایک ایسے ہی خاص طرح کے تعلق کو مستبعد نہ سمجھیں جیسا کہ انھوں نے آتشی شیشے وغیرہ کا آفتاب کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے۔

اگر اُن کو خالق و مخلوق کے درمیان اس قسم کے پوشیدہ تعلقات کے ممکن التسلیم ہونے میں تامل نہ رہا (اور غالباً نہ رہا ہوگا) تو پھر ہم بہت ہی تھوڑے سے غور و فکر کے بعد اُن خصوصیات کو طے کر سکیں گے جن سے کسی ایک یا چند معین اشخاص کی صداقت پر جو کبھی اس تعلق کے مدعی رہے ہوں کافی استدلال ہو سکتا ہو۔ لیکن

ہم ابھی تک تو اسی ورطۂ حیرت میں پڑے ہوئے ہیں کہ مثلاً دوپہر کا وقت ہی آفتاب ٹھیک نصف انتہا پر ہی۔ کنکریاں۔ سنگریزے۔ درخت کی شاخیں۔ زمین۔ زمین کے ریت۔ سمندر کا پانی اور لوہے کے کالے کالے ٹکڑے غرض دنیا کی سینکڑوں ہزاروں چیزیں اُس کے سامنے پڑی ہوئی ہیں۔ سورج کی روشنی میں ہر ایک شئے اُن میں سے الگ الگ دکھائی دیتی ہے۔ اور ہر ایک میں دھوپ کی کچھ نہ کچھ گرمی بھی محسوس ہو رہی ہے لیکن ان

ہی مختلف الانواع اشیائے کے بیچ میں اور اُن ہی کالے سیاہ آہن پاروں کے قریب ایک شخص بیٹھا ہے جس کے ایک ہاتھ میں آتشی شیشہ اور دوسرے میں کوئی سیاہ یا سبز چادر ہے اور جب وہ اپنے شیشے کو سورج کے روبرو کرکے چادر کو اُس کے مقابلہ پر لاتا ہے تو اُسی وقت چادر میں آگ سلگ کر دھواں اُٹھنے لگتا ہے اور جب شیشے کو سورج کے یا چادر کو شیشے کے سامنے سے سرکا دیتا ہے تو وہ تاثیر آتشیں باقی نہیں رہتی۔

یہ سارا تعجب انگیز ماجرا جب ہم ایک انتہا سے انتہا جاہل اور متعصب آدمی سے کرتے ہیں تو وہ بغیر کسی استعجاب کے اُس کو تسلیم کرنے لگتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے وہ بہت افسوسناک بیباکی کے ساتھ محال سمجھ کر تمسخر اُڑانے کو جائز رکھتا ہے۔ جب ہم اُس سے یہ کہتے ہیں کہ ایک خشک اور بے آب و گیاہ ریگستان میں جہاں بہت سے ایسے مختلف المذہب مختلف الطبائع اور مختلف الالوان لوگ جمع تھے جن کے پتھریلے معبودوں کی مانند سخت و سیاہ دلوں پر آفتاب کمالات کی شعاعیں بھی اپنا گہرا اثر نہ ڈالتی تھیں جن کے نہ برنہ مادی کثافتوں کے نیچے اُن کی لطیف روحانیت نے اپنے کو چھپا رکھا تھا اور جن کی جہالت آمیز حرکتوں اور غافلانہ بدمستیوں سے دُنیا کی اخلاقی مرقع کی اصلی صورت ایسی بگڑ گئی تھی کہ پہچانی نہ جاسکتی تھی۔

وہاں پر ایک ایسا صفا کیش اور روشن ضمیر انسان ظاہر ہوا جس کے قلب میں فطری طور پر کمالات آلہی سے استفادہ کرنے کی پوری استعداد ودیعت کیگئی تھی اور جس نے ہوش سنبھالتے ہی بغیر کسی ظاہری معلم کے تمام گرد و پیش کے خیالات سے علیحدہ ہوکر ایسی روش اختیار کی جو سیدھے معبود حقیقی تک پہنچانیوالی تھی۔ اس پاکیزہ سرشت انسان کو اپنے جبلی اخلاق اور برگزیدہ ملکات کی بدولت جو وہ بطن مادر سے اپنے ساتھ لایا تھا اُس

منبع الکمالات خالق سے ایک خاص انخاص نزدیکی اور مناسبت قائم ہوگئی اور جس وقت وہ خدا کا پاک طینت بندہ تمام فانی تعلقات کو فراموش کیے ہوئے دل سے طلب صادق کے ساتھ خدائے ذوالجلال کی جناب میں متوجہ ہوکر بیٹھا تو نہ معلوم کس غیر محسوس راستے سے ایک ایسی گرم روشنی اُس کے قلب کی تہ میں اُتری کہ پھر جو دل بھی سامنے آیا اُس کی ساری کدورتوں اور آلایشوں کو جلا کر کُندن بنا دیا

کیا کوئی عقل و انصاف کا حامی ان دونوں واقعوں میں جو ہم نے ذکر کیے مادیت اور روحانیت کے فرق کے سوا اور کوئی فرق ہمکو ایسا بتلا سکتا ہی جس سے ایک واقعہ تو ہماری احمق مخاطب کے نزدیک قابل تسلیم ٹھہرا اور دوسرے کی محال اور ناممکن سمجھ کر ہنسی اُڑائی گئی۔

بلاشبہ آتشی شیشہ اور آفتاب کی مثال ایک جسمانی مثال ہی جسکو ہم کسی روحانی مسئلہ کے استدلال میں بقاعدۂ منطق پیش نہیں کرسکتے لیکن آپ اطمینان رکھیں کہ نہ ہم نے اس کو اپنا استدلال بنانا چاہا ہی اور نہ فی الحقیقت ہم کو بنانے کی ضرورت ہے۔

ہم اوائل تحریر میں یہ بتلا چکے کہ ہماری غرض اصلی اس موقع پر صرف اس قدر ہی کہ آپ خدائے بزرگ کے اور اُس کے بندوں کے مابین ایک ایسے مخصوص تعلق کے ممکن ہونے سے انکار نہ فرمائیں جس کے ساتھ حضرت رب العزت کے بعض افادات خاصہ وابستہ ہوں پس اگر آپ اس قسم کے تعلق کو ناممکن اور محال سمجھیں گے تو درحقیقت مدعی آپ ہونگے اور استدلال و برہان سے کسی بات کا ثابت کرنا بھی بحیثیت مدعی ہونیکے آپ ہی کا منصب ہوگا۔ کیونکہ یہ بدیہی قاعدہ ہی کہ اگر کسی چیز کے وجود و عدم (ہونے نہونے) کے متعلق نزاع ہو تو اُس میں مدعی وجود کا ماننے والا سمجھا جاتا ہی اور بخلاف اس

کے اگر گفتگو کسی چیز کے امکان و امتناع (ہو سکنے اور نہ ہو سکنے) میں ہے تو اب مدعی وہ شخص جو اُس کو ناممکن اور ممتنع سمجھے۔

اس اعتبار سے اگر میں بغیر کسی مزید توضیح کے یہ کہہ دیتا کہ بعض بنی آدم اور خدائے عزوجل میں بعض ایسے تعلقات ممکن ہیں جو اُس کے اور بنی نوع میں نہ پائے جاتے ہوں تو مجھ سے کسی قسم کے مطالبہ دلیل کا استحقاق نہ تھا بلکہ مجھ کو حق تھا کہ میں اپنے اُن مخالفوں سے جو ایسے تعلقات کو محال کہتے ہوں حجت طلب کروں۔ لیکن میں نے مناظرہ کے پہلو سے درگذر کر کے محض تقریب الی الفہم اور تسکین خاطر اور رفع اضطراب کے لئے ایک محسوس و مشاہد نظیر بھی اپنے مدعا کی تبرعاً پیش کر دی تا کہ جو لوگ مادیات و محسوسات کے دائرہ سے ایک قدم باہر نکالنے کے خوگر نہیں ہیں وہ بھی ان غیر محسوس تعلقات کی نوعیت سے فی الجملہ واقفیت حاصل کر سکیں۔

یہ ایک اتفاقی اور بہت ہی فائدہ مند بات ہوئی کہ جب ہم خالق و مخلوق کے ان پنہانی تعلقات پر بحث کر رہے تھے اور نظیروں اور مثالوں کے ذریعہ سے اُن کو دلنشین کرتے جاتے تھے تو اُس کے ضمن میں ہمکو چند ایسے اصول و اسباب کے سُراغ لگانے کا بھی موقع ملگیا۔ جن پر یہ تعلقات واقع میں متفرع ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے یہ جان لیا کہ ان تعلقات خاصہ کی بنا اُس قرب و مناسبت پر ہی جو کسی انسان کو خدائی تعالیٰ سے اپنی روحی لطافت میں کامل اور اخلاق حمیدہ سے متصف ہونیکی وجہ سے حاصل ہوتی ہے اور اس لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص ان اعلیٰ اوصاف کے ساتھ موصوف راستی کا حامی اور کمینہ اخلاق و ذمائم سے محترز ہو گا اُس کو بعید نہیں کہ بسبب قرب روحانی کے خدائے عزوجل کی جانب سے اندرونی طور پر اس قسم کے افاضات خاصہ ہوتے ہوں۔ جو اُس

کے دوسرے بنی نوع کو نہ ہوں۔ اور وہ اُن اسرار الٰہی پر مطلع ہوتا ہو جن کے دریافت کرنے سے اور لوگ عاجز رہ گئے ہوں۔ خدائے اقدس نے اپنے کمالات کا اُس کو آئینہ بنا لیا ہو اور اسی شان مرآتیت کی وجہ سے اُس کے دل میں خدا تعالیٰ کے نہایت غامض اور دقیق مافی الضمیر بھی منعکس ہو جاتے ہیں۔

اگر فرض کرو کہ ہم کو دُنیا میں کسی معتبر ذریعہ سے ایسے ایک یا چند آدمیوں کے وجود کا پتہ لگ گیا جن میں یہ صفات اعلیٰ اور اکمل حیثیت کے اندر پائے جائیں تو یقیناً یہی لوگ ہماری اُن بیمار عقلوں کے درد کا درماں بن سکیں گے جن کے مرض کا مفصّل تذکرہ ہم صفحہ ۴۶ میں کر چکے ہیں اور جن کی نسبت ہم نے کہا تھا کہ وہ مبتلائے امراض رہنے کی وجہ سے اپنے نیک و بد اور نافع و مضر میں اُسی طرح صحیح تفریق نہیں کر سکتے جس طرح ایک بیمار آدمی بخار کی وجہ سے عمدہ عمدہ کھانوں کو بُرا سمجھنے لگتا ہے جو اُس کو طبعاً مرغوب ہیں اور دُنبل کی جلن یا خارش کی نوچ میں اپنے بدن کے تراشنے اور کھال کے نوچنے پر بے اختیار مائل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ حالت صحت میں اس حرکت کو ہرگز عزیز نہیں رکھتا تھا۔

یہ اُس خدائے بے نیاز کا بہت بڑا احسان ہے کہ میں نے جس مقصد کے ثابت کرنے کے واسطے چلنا شروع کیا تھا یہاں پہنچکر میں نے اس کو پا لیا۔ اور حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کے آغاز سے انجام تک حسب ذیل نتائج برآمد ہوئے۔

(۱) افعال انسانی میں نیک و بد کی تقسیم ہر فرد بشر کو خواہ وہ کوئی مذہبی آدمی ہو یا دہری ماننا ضروری ہے۔

(۲) عقل سلیم جس کام کو اچھا یا بُرا بتلائے وہ ویسا ہی ہوتا ہے اور شریعت کے

احکام بھی عقل سلیم کے مطابق ہوتے ہیں۔

(۳) عقل اور قوۃ عملیہ میں ایسا رابطہ خاص ہے کہ اُن میں سے ہر ایک کا اثر دوسرے تک پہنچتا ہے اور حرکات ناشایستہ اور افعال ذمیمہ کا کسی شخص سے سرزد ہونا اس کی دلیل ہے کہ اس کی قوۃ علمیہ (عقل) مریض یا کمزور ہے۔

(۴) عقل سقیم (مریض) جس شے کو نافع یا مضر بتلائے اُس پر اطمینان نہیں ہوسکتا اس بارہ میں عقل سلیم درکار ہے۔

(۵) ہر ایک چیز کے حسن و قبح سے کما حقہٗ خدا تعالیٰ ہی واقف ہوسکتا ہے یا وہ شخص جس کو خدا تعالیٰ محض اپنے فضل و عنایت سے جس حد تلک واقف کردے۔

(۶) خدا تعالیٰ کے فیوض و عنایات خاصہ سے ہر ایک انسان بقدر اپنے قرب مناسبت کے مستفید ہوتا ہے۔

(۷) جس قدر کوئی عقل لطیف یعنی نفسانی آلائشوں اور مادی کثافتوں سے پاک وصاف ہو کر اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاق کے ساتھ مزین ہوگی اُسی قدر اُسکو خدائے عزوجل سے قرب و تعلق حاصل ہوگا اور ایسی ہی عقلوں کو ہم عقول سلیمہ کے نام سے یاد کرنیکے مستحق ہوں گے۔

ان صاف و صریح مگر مہتم بالشان نتائج کے سمجھ لینے کے بعد صرف یہی نفع نہیں ہوا کہ ہم اپنے ایک خاص مقصد میں بقدر ضرورت کامیاب ہو گئے بلکہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر پر جو کچھ نکتہ چینیاں پہلے کی گئیں تھیں اُن میں سے اکثر کا جواب بھی ضمناً اسی بیان سے نکل آیا۔ چنانچہ جن ناظرین کو امام ممدوح کی تقریر اور اُس کے متعلق شبہات یاد ہونگے وہ خود ہماری پوری تقریر پر مکرر نظر ڈالکر امید ہے کہ ہر ایک شبہ کا جواب دریافت کرلیں گے۔

البتہ سرسید کے اُس اعتراض کا کوئی جواب ہمارے مضمون میں ابھی تک نہیں آیا کہ

جب عموماً لوگوں کی عقلیں مبتلائے امراض رہنے کی وجہ سے صحیح وفاسد اور نیک وبد میں تمیز نہیں کرسکتیں اور نہ وہ ہر ایک بھلے بُرے کے پہچاننے کے واسطے کافی ہیں تو ہمکو خدا تعالیٰ کی جانب سے احکام شرعیہ کا مکلف بنانا کیونکر صحیح ہوا حالانکہ انسان اپنے ذی عقل ہونے کی کیوجہ سے تمام حیوانات کے برخلاف شرعیات کا مخاطب قرار دیا گیا ہے۔

اس کا جواب مختصراً تو صرف اتنا ہی ہے کہ شریعت نے جن چیزوں کے بچنے یا کرنے کی جس حد تک تکلیف دی ہے اُن میں سے کوئی چیز بھی ہمارے حیطۂ قدرت سے خارج نہیں ہے اور ہمارے ذی عقل ہونے اور اپنے ابنائے جنس سے ممتاز بنے کا یہ نفع کافی ہے کہ ہم خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت پر مطلع ہو کر اپنے جملہ ارادات اور حرکات وسکنات کی باگ اُن دونوں کے ہاتھ میں دیدیں اور اجمالاً یہ جان لیں کہ جن دونوں کی صداقت کا ہم کو یقین ہو چکا ہے وہ بلا شبہ ہمارے کامل خیر خواہ اور کامل حکمت والے ہیں۔ اور اُن کی ہر ایک چھوٹی سی چھوٹی تعلیم پر کاربند ہونا ہمارے لئے فلاح وسودمندی سے خالی نہیں ہے اگرچہ ہم اُن کل احکام کی یا اُن میں سے بعض کی تفصیلی حکمتوں اور مصالح پر مطلع نہ ہو سکے ہوں۔

اور یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک ماہر ڈاکٹر جب کسی دوا یا غذا کے متعلق مفید یا مضر ہونے کا فتویٰ دیتا ہے تو ہم خواہ اُس چیز کے خواص وکیفیات بلکہ نام سے بھی صحیح طور پر آشنا نہ ہوں اور خواہ جس کے استعمال کا وہ حکم دیتا ہے اُس سے نفرت اور جس سے وہ منع کرتا ہے اُس کی طرف رغبت بھی ہو مگر ڈاکٹر کی تجربہ کاری اور بہی خواہی پر اعتماد کرکے جس کو ہم نے محض ایک کمزور اور ضعیف گمان کے ساتھ تسلیم کر رکھا ہے۔ ہم اُن دوا یا غذا کے استعمال کی نسبت اپنا سابق رویہ بدل ڈالتے ہیں اور اس تبدیلی کیوقت بیچاری

عقل کی ایک بھی نہیں سُنتے بلکہ یوں تاویل کر کے تسلی کر لیتے ہیں کہ عاقلوں کی پیروی بھی درحقیقت عقل کی ہی پیروی ہے تو اس حیثیت سے گویا ہم نے عقل کے اشارہ کے بغیر کوئی جنبش نہیں کی۔

یہی حال بعینہٖ مذہب و شریعت کا ہے لیکن ہمکو تعجب کے ساتھ افسوس ہوتا ہے۔ کہ سرسید نے ایک نرالی منطق سے اور عجیب گول مول الفاظ میں لوگوں کے دلوں سے ہمارے اس صحیح خیال کو مٹانا یا کم از کم سست کر دینا چاہا ہے جس جگہ وہ لکھتے ہیں کہ۔

"ہمارا یہ اُصول نہایت جنچا ہوا ہے کہ انسان صرف بسبب عقل کے جو اس میں ہے مکلّف ہوا ہے پس جس بات پر وہ مکلّف ہوگا ضرور ہے کہ فہم انسانی سے خارج ہو ورنہ معلول کا وجود بغیر علت کے لازم آتا ہے جو محال و ممتنع ہے پس جن اخلاق کے پکڑنے اور چھوڑنے پر انسان مکلّف ہے وہ ضرور عقل انسانی سے خارج نہیں"

(تہذیب الاخلاق جلد دوم مطبوعہ لاہور۔ مضمون کانشنس صفحہ ۱۲۳)

میرا یہ سوال سرسید سے ہے کہ جس عقل کو وہ تکلیف شرعی کے واسطے علت قرار دیتے ہیں۔ اُس سے کیا مراد ہے آیا فقط قوۃ ادراک کا انسان میں موجود ہونا یا اُس سے ہر ہر چیز کو تفصیلاً جاننا اگر پہلی صورت اختیار کی جائے تو بعض احکام و اخلاق کے فوائد و علل پر مطلع ہونے سے علت و معلول میں جدائی کس طرح لازم آئی اور اگر خدانخواستہ سرسید نے دوسری شق کو لیا ہے تو میں تسلیم نہیں کرتا کہ جو علت تکلیف کی سرسید نے قرار دی ہے وہ صحیح ہے اور آپ حیرت کرینگے جب یہ سُنیں گے کہ جیسا کہ میں اس شق کو تسلیم نہیں کرتا۔ خود سرسید بھی اُس کے اعتراف کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ اُسی مضمون کے دوسرے

حصہ میں وہ لکھتے ہیں ؎

"اس بیان سے جو ظاہرا بالکل سیدھا اور صاف ہے اور ریچ اور پیچ اس میں کچھ نہیں ہے اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ کانشنس فی نفسہ کوئی چیز نہیں ہے اور نہ وہ ابتداً کسی مذہب کا اصل اصول قرار پانے کے لائق ہے اور نہ وہ فی حد ذاتہ رہنما ہونے کے مستحق ہے ہاں بلاشبہ سچے اصول پر انسان کی طبیعت تربیت پا جائے یا سچے خیالات سے اس کی طبیعت موثر ہو جاوے اور طبیعت سچائی کے مطابق حالت پیدا کرے تب وہ حالت طبیعت یعنی کانشنس انسان کا رہنما ہوتا ہے۔ (ایضاً تہذیب الاخلاق صفحہ ۱۲) دوسری جگہ لکھتے ہیں ؎

"ہاں یہ سچ ہے کہ قانون قدرت پر غور و فکر کرنے سے وہ صحیح اخلاق جو انسان کی طبیعت کو ایسی حالت پر کر دیں جو کبھی دھوکہ نہ دے دریافت کر سکتے ہیں مگر کب جبکہ انسان کی معلومات کو ایک کافی ترقی اور قوانین قدرت پر اور ان مختلف قویٰ کے اوپر جو اس کے بانی نے انسان میں رکھے ہیں ایک معتدبہ آگاہی حاصل ہو۔ تمام انسان ان دقائق پر نہیں پہنچ سکتے اور جو پہنچ سکتے ہیں وہ معدودے چند کے سوا نہیں ہو سکتے اور وہ بھی نہ اپنی عمر میں بلکہ پشتوں در پشتوں اور صدیوں در صدیوں میں پس اس لئے تاکہ اس قادر مطلق کی حکمت بیکار نہ رہے۔ ضرور ہوا ہے کہ وقتاً فوقتاً ملک اور زمانہ کی حالت کے لحاظ سے ایسے ہادی پیدا کئے جائیں جن میں خلقی ایسا مادہ دیا گیا ہو اور جو باعتبار اپنی فطرت کے ان سچے اخلاق کے بیان کا مخزن ہو۔"

(ایضاً صفحہ ۱۲۳)

ان دونوں عبارتوں سے بھی اور اُن کے اور بعض تصریحات سے بھی یہ ثابت ہو گیا کہ جملہ احکام شرعیہ کے لم اور علّت کو سمجھ لینا گو مطلق عقل انسانی سے خارج نہیں ہے لیکن ہر عقل شخصی کا یہ منصب بھی نہیں کہ ہر ایک حکم کی حقیقت اور کنہ کے سمجھ لینے کا وہ دعویٰ کر بیٹھے۔ تو سرسیّد کے اصول کے موافق سوال یہ ہے کہ سوائے اُن معدودے چند انسانوں کے جو دقائق شریعت سے خبردار ہوں (جیساکہ سرسیّد بزعم خود تھے) اور لوگوں کو جو ایسے نہیں ہیں مکلف بنانا کیوں کر صحیح ہوا حالانکہ جن باتوں کے کرنے یا چھوڑنے پر اُن کو برانگیختہ کیا جاتا ہے وہ اُن کی عقل شخصی سے یقیناً خارج ہیں۔

پس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ ہم گرفتاران ہوا و ہوس اور مریضان عقل و ادراک اُن ارباب عقول سلیمہ کو جن کے کچھ اوصاف ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اطبائے روحانی سمجھ کر اپنے لئے کم از کم اسی طرح موت دائمی اور ہلاکت ابدی سے نجات دلانیوالا تصور کریں جیساکہ ایک جاہل بیمار جو بغرض تداوی کسی طبیب حاذق کے آستانہ پر حاضر ہو کر اُس کی نسبت خیال رکھتا ہے اور جس طرح ایک دیہاتی مریض اپنے معالج ڈاکٹر کے کہنے سے فقط اس اعتماد پر کہ وہ اُس کے خواص اور منافع و مضار سے کما حقہ آگاہ ہو گا۔ کونین کے (یا کسی نامعلوم الاسم دوا کے) کھانیکے لئے بلا پس و پیش آمادہ ہو جاتا ہے (حالانکہ ذاتی طور پر وہ اُس سے کچھ بھی واقفیت نہیں رکھتا) ٹھیک اسی طرح ارباب عقول سقیمہ کو لازم ہے کہ وہ ارباب عقول سلیمہ کے احکام کے سامنے بالکل گردن ڈالدیں اور اُن نسخہ جات کے استعمال کرنے اور پرہیز کے قائم رکھنے میں جن کا ارباب عقول سلیمہ نے امر فرمایا ہو ایک لمحہ کے لئے بھی توقف۔ تردد اور تنگدلی کو دخل نہ دیں بشرطیکہ طبیب کے طبیب اور اُن نسخہ جات کے بامر طبیب ہونے میں اُن کو کوئی شبہ باقی نہ رہ گیا ہو۔

فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک — پس قسم ہے تیری پروردگار کی کہ یہ لوگ ایمان سے ہرگز بہرہ

فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی — یاب نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ تمکو (اے پیغمبر) اپنے باہمی منازعات

انفسھم حرجا مما قضیت — میں حکم نہ ٹھہراویں اور پھر تمہارے فیصلہ کے سامنے بغیر

ویسلموا تسلیما۔ — کسی قسم کی دل تنگی کے گردن تسلیم خم کردیں۔

ممکن ہے کہ یہ سوال اُٹھایا جاوے کہ جب ارباب عقول سقیمہ کو محض اپنے عقلوں پر اعتماد کرنا اور اُن کی ہدایات اور احکام پر چلنا ہی روا نہیں رہا اور نہ کسی شرعی معاملہ میں اُن کے اقتضاآت عقلیہ کی توثیق و تصویب ضرور قرار دیئے گئے تو آخر اس کے باور کرلینے کی ہی ہمارے پاس کیا ضمانت ہے کہ عقل سلیم و سقیم کے امتیاز اور طبیب و مریض کی تشخیص اور معالج و مستعلج کی جستجو میں وہی مریض عقلیں صحت و استقامت کے ساتھ ضرور کامیاب ہوجائیں گی اور اس کا احتمال باقی نہ رہیگا کہ جس شخص کو انھوں نے تندرست شمار کیا ہے وہ فی الحقیقت بیمار ہو اور جس کو اپنا نجات دہندہ طبیب سمجھے ہیں وہ ایک نااہل اور خطرہ جان ہلاکو ہو۔

لیکن ایسا سوال پیش کرنے والوں کو تھوڑی دیر کے واسطے اس پر غور کرنا چاہئے کہ اگر کسی اجنبی بستی میں کوئی اجنبی طبیب آجائے اور وہاں کے لوگوں سے اپنے فن کی حیثیت میں تعارف پیدا کرنا چاہے (حالانکہ وہ لوگ نہ تو نظریات طب سے خبردار ہیں اور نہ انواع مرض سے واقفیت رکھتے ہیں اور نہ اُن کے لئے طرق علاج کی صحت و غلطی کا دریافت کرنا آسان کام ہے) تو ایسی صورت میں اُس طبیب کو اپنے مقصد میں کامیاب ہونیکے لئے کیا تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہیں۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ سب سے پہلے تو وہ مجامع و مجالس میں موقع بموقع اپنے

طب دانی کا تذکرہ کریگا اپنے مطب پر ایک بڑا سا سائین بورڈ لگا بیگا اور وقتاً فوقتاً اپنے اسانید کو جو کسی معتبر مدرسے اس کو دستیاب ہوئے ہونگے خواص کے روبرو پیش کرتا رہیگا اور اُس کے بعد کچھ لوگ تو عام چرچا سُنکر اور محض شہرت پر ایمان لاکر اور کچھ محض امتحان اور جانچ کرنے کی نیت سے اور کچھ طبیبوں کے احوال و اطوار سے قدرے واقفیت رکھنے کی وجہ سے اُس کے پاس بغرض معالجہ آنے لگیں گے اور بہت سے مریضوں کے پاس اپنا اعتبار بڑھانے اور مطب کو چمکانے کے لئے وہ بذات خود بغیر کسی قسم کی فیس اور مالی معاوضہ کے دور دراز کے تعلقات جتلا کر چلا جائے گا۔

اب اس ساری جدوجہد اور دوادوش میں اگر کچھ بیماروں کی شفا اُس کے ہاتھ سے مقدر ہی تو وہ اُس کی اولین کامیابی کا باعث ہوگی اور جوں جوں کہ یہ سلسلہ ترقی کرتا جائے گا۔ اسی قدر اس کی عزت اور مقبولیت کو چار چاند لگتے جائیں گے انتہا یہ ہے کہ وہ کچھ زمانہ کے بعد شہرت عامہ کے اس درجہ پر پہنچ جائے گا کہ مریضوں کو اُس کے یہاں پہنچنے کیلئے استدلال اور غور و فکر کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اور عوام کے محاورات میں شفا و صحت تو اس کے معالجانہ کوششوں کی طرف اور موت و ہلاکت خالی بخت و اتفاق یا مشیت ایزدی کی طرف منسوب ہونے لگے گی بلکہ اس سے بھی بڑھکر یہ کہ دوسرے نئے طبیبوں کی مقبولیت کا معیار ہی اب اُس کی تسلیم و تصدیق قرار پا جائیں گے۔

بعینہ اسی پر اطبا روحانی (انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے حالات کو قیاس کرو۔ جب وہ عالم کی ہدایت و اصلاح کیلئے مبعوث ہوتے ہیں تو سب سے اول وہ

اپنے من اللہ بشیر و نذیر ہونے کا نہایت زور شور اور تحدی کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں اور اپنی دعوت و تبلیغ کا غلغلہ اہل و عیال اور خویش و اقارب سے شروع کر کے مشارق و مغارب میں ڈال دیتے ہیں جس کو سن کر کچھ لوگ تو اُن کے سابق چالیس سالہ زہد و ریاضت پاک و صاف اخلاق۔ دیانت و راستبازی اغراض عن المال والجاہ شرافت حسب و نسب اور روشن خوارق یا آیات بینات وغیرہ امور کی وجہ سے اور بہت سے محض ازراہ امتحان و تفتیش ہی فطرۃً اُن کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور بہت سے وہ خوش قسمت ہیں کہ خود انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسّلام اپنی قوت قلبیہ اور ہمت باطنی۔ کے زور سے باذن اللہ اُن کو اپنی طرف جذب کر لیتے ہیں اور اسی اثنا میں جب یہ لوگ روحانی امراض سے یکایک شفایاب ہونے لگتے ہیں اور اُن کے دلوں کی تاریکی دور ہو کر جمال خداوندی کا عکس اُن میں پڑنے لگتا ہے تو وہ اپنے ہادی کی نسبت فوراً چلا اُٹھتے ہیں کہ :-

ما ھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم

اُس وقت ان مریضوں کو بھلا چنگا دیکھ کر اور اُنکے حالات سابقہ میں ایسا انقلاب عظیم پاکر اوروں کے دل بھی نرمانے لگتے ہیں اور اُن کو ان کی صحت کی بحالی پر رشک آنے لگتا ہے پھر تو مخلوق خدا فوج در فوج اور جوق در جوق ہو کر اُس پاک بندے کے گرد جمع ہو جاتی ہے اور اپنے اپنے امراض کا مرافعہ اس کی طرف کرتی ہے اور جیسے جیسے کہ یہ سلسلہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے اندھوں کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں۔ اور غافلوں کو عبرت حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آتا رہتا ہے اُس کے بعد اس کے طبیب حاذق یا نبی مرسل) سمجھنے کے واسطے نہ کسی استدلال کی ضرورت رہتی ہے اور نہ اُس میں

بہت زیادہ مدقیق اور غور و خوض کو کام فرمانے کی۔

الغرض جس وقت طبیب حاذق (نبی) کی شناخت کیلئے انسان کو اپنے دماغ پر کچھ زور ڈالنے کی ضرورت تھی اُس وقت تو چند قدرتی اسباب کی بناپر یہ شناخت بغیر زور ڈالے ہی حاصل ہوگئی اور اب جبکہ اُس کے حذاقت کے نتائج متمثل ہوکر گویا آنکھوں کے سامنے نمودار ہوگئے ہیں تو اس بحث میں کدوکاوش کی مطلقاً حاجت ہی باقی نہیں رہی ہر شخص اُن محسوس و مشاہد نتائج کو دیکھکر اسی طرح اُس کے طبیب حاذق (نبی) ہونے کا یقین کرسکتا ہے جیسا کہ کسی گھر کے صحن میں دھوپ نکلی ہوئی دیکھکر آسمان پر آفتاب کے نکلنے کا۔

اور اس بدیہی بلکہ اجلی البدیہیات کے سمجھنے کے واسطے انسان میں ذراسی عقل بھی خواہ وہ کتنی ہی علیل کیوں نہو کفایت کرتی ہے بشرطیکہ وہ اس سے کام لینے کی کوشش کرے اور حق کے دیکھنے سے جو اُس کو چمٹنا چاہتا ہے بالکل آنکھیں بند نہ کرلے اور جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کرچکے ہیں ارباب عقول سقیمہ سے یہ مطلب ہمارا ہرگز نہیں ہے کہ اُن میں کسی موٹی سی موٹی اور روشن سی روشن بات کے سمجھنے کی بھی قابلیت باقی نہ رہی ہو اور محسوسات کے ادراک کی استعداد بھی اُن سے سلب کرلی گئی ہو۔

تم خود خیال کرو کہ کسی تجربہ کار طبیب کے ہاتھ پر تپ کہنہ کے پانچ چار مریض (جو زندگانی سے مایوس ہوچکے ہوں) شفایاب ہوجائیں تو گھر گھر میں اُس کا چرچا پھیل جاتا ہے اور دور دراز شہروں کے مایوس العلاج بیمار اُس کی طرف رجوع کرتے لگتے ہیں اب اگر فرض کرو کہ ایک طبیب کے دست شفا سے کوئی بستی کی بستی یا ملک کا ملک تپ کہنہ سے صحت یاب ہوجاوے تو اُس کی طرف لوگوں کی توجہ کیا کسی منطقی استدلال

کے محتاج رہینگی۔

مثلاً سرخیل اطبار روحانی جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلیم (جیساکہ ہم نے اپنے رسالہ الاسلام میں نہایت مفصل بیان کیاہے اور یہاں مصلحتاً ہم اپنے زمانہ کے ایک (اصلاحی روشن خیال مؤلف کے الفاظ میں لکھتے ہیں) ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے جبکہ دُنیا ایک عجیب روحانی سکتے کی حالت میں تھی۔ اور آپ ایسے ملک میں مبعوث ہوئے جہاں اخلاقی تعلیم کا کچھ سامان نہ تہا اور ایسی قوم کی اصلاح آپکے ذمہ کی گئی جو سوائے اوہام اور فاسد عقیدوں اور باطل خیالات اور غلط رایوں اور وحشیانہ اعمال اور بد اخلاقی اور نفاق اور جنگ جوئی کے کسی قسم کی اخلاقی خوبی نہ رکھتے تھے مگر آپ کے الہامی بیان اور خدائی قوت نے ان پر ایسی عجیب و غریب تاثیر کی کہ اُس سے اُن کی تمام ظاہری و باطنی حالتیں بدلگئیں۔ برسوں کے بھٹکے ہوئے خدا کی راہ پر چل نکلے اور مدتوں کے سوتے ہوئے غفلت کی نیند سے چونک پڑے جو مشرک تھے وہ موحد ہوگئے جو کافر تھے ایمان لائے جو بُت پرست تھے وہ بُت شکن بنگئے جو گمراہ تھے وہ خدا کی راہ دیکھنے لگے۔ جاہلانہ حمیت اور وحشیانہ عصبیت کا ان میں نام نہ رہا۔ خاندانی جھگڑے اور پشتینی عداوتیں جاتی رہیں۔ دماغ غرور و نخوت سے خالی ہوگئے۔ اور اُن کے دل صبر و توکل۔ حلم و بردباری۔ زہد و پرہیزگاری اور جمیع اخلاقی صفات سے بھر گئے۔ آپ کی تعلیم و ہدایت نے ایک ایسا گروہ خدا پرست پاک طبیعت راستباز۔ نیک دل لوگوں کا قائم کردیا جن کی کوششوں سے شرک و بُت پرستی کی آواز جو تمام جزیرہ نمائے عرب میں گونج رہی تھی بند ہوگئی اور اُس کے بدلے ایک بیچوں و بیچگوں شبہ و بے نموں خدا کی منادی پھرگئی۔ بتوں نے عدم کا راستہ لیا۔ تثلیثوں کا نشان مٹ

گیا آتشکدے ٹھنڈے پڑ گئے۔ تثلیث کا طلسم ٹوٹ گیا اوہام پرستی کا باطل خیال باطل ہو گیا۔

جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔ حق ظاہر ہو گیا۔ اور باطل مغلوب۔ بلا شبہ باطل مغلوب ہی ہو کر رہتا ہے۔

کیا اس سے اس امر کا مشاہدہ اور درخشان ثبوت نہیں ملتا کہ آپ حقیقت میں سچے رسول (طبیب حاذق) اور خدا ہی کی طرف سے موید تھے ورنہ انسان کا کام نہ تھا کہ وہ ایسا انقلاب عظیم عرب کی روحانی اور اخلاقی حالت میں پیدا کر دیتا اور ایسے جنگ جو ستم پیشہ لوگوں کو جو بات بات پر لڑتے اور جھگڑتے تھے۔ اخوۃ کے ایک رشتہ میں باندھ دیتا اور اُن کی پشتینی عداوتوں اور کینوں سے اُن کے دلوں کو ایسا صاف کر دیتا کہ اُس کا کچھ اثر باقی نہ رہتا بلکہ دُنیا میں اخلاق اور انسانیت کا نمونہ بنا دیتا۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی ایسی عجیب و غریب تاثیر اور ایسے حیرت انگیز نتائج کو دیکھ کر منکرین بھی اس بات کے معترف ہیں کہ درحقیقت یہ بات بشر کی قدرت سے خارج تھی۔ چنانچہ کوئی اُن میں سے کہتا ہے کہ "وہ پیام جو آپ لائے وہ ایک سچا اور حقیقی پیام تھا جس کا مخرج وہی ہستی تھی جس کی تھاہ کبھی کسی نے نہیں پائی" کوئی لکھتا ہے کہ "قرآن ہی کی تعلیم کا یہ اثر ہے کہ عرب کے رہنے والے ایسے بدل گئے جیسے کسی نے سحر کر دیا ہو" متعصب سے متعصب عیسائیوں میں سے سخت سے سخت متعصب یہ اقرار کرتا ہے کہ "دین مسیحی کی ابتداء سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تک کبھی حیات روحانی ایسی برانگیختہ نہیں ہوئی تھی جیسی کہ اسلام کی تعلیم سے ہوئی۔"

پھر کیا ایسے ایسے داشگاف ثبوتوں اور کھلی کھلی دلیلوں کے بعد بھی کوئی محروم البصیرۃ ایسا نکلے گا جو باوجودیکہ اپنے کو مریض سمجھتا ہو اور کسی نباض اور ماہر طبیب کی طرف رجوع کرنے کا خواہشمند بھی ہو، لیکن طبیب عرب (نہیں بلکہ طبیب عرب و عجم) کے ان چمکتے ہوئے کارناموں سے مُنہ پھیر لے اور اُس کی تجویز اور تشخیص کے سامنے (جو لاریب خدا کی ہی تجویز و تشخیص ہے) بے چون و چرا اور بے ریب و تردد گردن نہ ڈالدے اور کم از کم تجربہ ہی کے طور پر اُس کے بتائے ہوئے تدابیر و معالجات و پرہیز پر چند روز عمل کر کے نہ دیکھے۔

ایسے ہی کور باطنوں کی نسبت (جو ابھی تک اس طرح کی بدیہی صداقت کے تسلیم کے واسطے نہایت پیچیدہ اور دور از کار مسائل و دلائل کی تلاش میں فضول سرگرداں رہ کر عمر عزیز ضائع کر رہے ہیں اور دن سے زیادہ روشن واقعات کی طرف آنکھ نہیں اُٹھاتے) عارف باللہ حضرت شیخ محی الدین بن العربی قدس اللہ سرہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

"ہمارے نزدیک سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ انسان (ہر بات میں) خدا کو چھوڑ کر محض اپنی نظر و فکر کی ہی تقلید کرے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اُس کی یہ فکر بھی خود اُس ذات کی طرح ایک امر حادث اور مخلوق ہے اور اُن قوی میں سے ایک قوۃ ہے جو خدائے تعالیٰ نے انسان کے اندر ودیعت کی ہیں (اسے معلوم ہی) کہ اللہ تعالیٰ نے قوۃ مفکرہ کو عقل انسانی کیواسطے ایک خادم بنایا ہے (لیکن اس پر بھی) عقل خود اُس کی خادم بنکر پیچھے ہو لیتی ہے۔ باوجودیکہ یہ وہ بھی جانتی ہے کہ قوۃ مفکرہ جو کچھ اُس کو عطا کرتی ہے وہ اُس میں اپنے حدود مرتبہ سے ذرا بھی تجاوز نہیں کر سکتے اور وہ اس سے عاجز ہے کہ کسی دوسری قوۃ کی سرحد میں قدم رکھ سکے۔ مثلاً قوۃ حافظہ یا مصورہ کا کام اُس سے نکل سکے

یا قوت متخیلہ کے قائم مقام بن سکے یا حواس خمسہ (لمس۔ طعم۔ شم۔ سمع۔ بصر) میں سے وہ کسی ایک کے فرائض کو انجام دے سکے۔

یہ سب کچھ ہے اور قوتِ مفکرہ کی حدود و اختیارات کی یہ تنگی بھی سب کو معلوم ہے مگر اس پر بھی یہ کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ عقل انسانی اپنے پروردگار کی معرفت کے بارے میں اُسی فکر ناقص کی تقلید پر اڑی ہوئی ہے اُس کا پروردگار خود جو کچھ اپنی کتاب میں اور اپنے رسول کی زبانی اپنی نسبت بیان فرماتا ہے اُس کی تقلید سے برابر کتراتی ہے۔

عالم میں جو غلطیاں مختلف طرح کی پھیلی ہوئی ہیں عقل کی یہ غلطی اُن سب میں عجیب تر ہے اور تماشہ ہے کہ سوائے اُن معدود لوگوں کے جن کی بصیرت کی آنکھیں خدائے تعالے نے روشن کر دی ہیں ہر صاحب فکر اسی عام غلط کاری میں مبتلا ہے۔ ہاں ارباب بصیرت خوب جانتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے ہر چیز کی ایک خاص فطرت بنائی۔ (اور اُسی خاص فطرۃ کے اعتبار سے اُس شے کی عمل و حرکت کی حد بندی کر دی ہے) مثلاً قوت سامعہ (یا کانوں کی فطرت) مسموعات (آوازوں) کے ادراک سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ اور عقل انسانی فقط اسی حلقہ میں اُسکے محتاج اور آوازوں کی شناخت۔ حروف کے قطع و برید۔ الفاظ کے تغیرات اور لغات کی تقسیم میں اُس سے امداد کے طالب ہے چنانچہ عقل انسانی قوۃ سامعہ ہی کے ذریعہ سے پرندوں کے چہچہے ہواؤں کی سائیں سائیں۔ کواڑوں کی چوں چوں۔ پانی کی خرخر۔ انسان کی چیخ و پکار اور دوسرے جانوروں کی بولیوں میں تفریق کرتی ہے ورنہ عقل انسانی میں بجائے خود یہ قدرت کہاں کہ بغیر توسط سمع کے اِن چیزوں کے باہمی امتیازات کو قایم رکھ سکے۔

اسی طرح قوت باصرہ (آنکھوں) کو خیال کرو کہ اُس کا دائرہ عمل محض مبصرات (دکھائی دینے کے قابل چیزوں) تک محدود ہے یعنی عقل کو اُس کی امداد کے بغیر سبزی کو زردی سے اور زردی کو سفیدی سے اور سفیدی کو سیاہی سے اور اسی طرح ہر ایک رنگ کو دوسرے رنگ سے جدا کرنا عادۃً ممکن نہیں ہے اور یہی حال ان دونوں کے ماسوا دوسری اُن تمام قوتوں کا ہے جو حواس کے نام سے مشہور ہیں۔ اور نیز قوت خیالیہ کا حس کو اپنی کارگذاری میں حواس خمسہ کی احتیاج ہے۔ کیونکہ تخیل فقط اُن چیزوں کے ساتھ ہی متعلق ہو سکتا ہے جو حواس کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔ علی ہذا القیاس۔ قوۃ حافظہ اگر خیال کی حاصل کی ہوئی اشیاء کو روکے نہ رکھے تو خیال کے خزانہ میں کچھ بھی باقی نہ رہے۔ اس حیثیت سے جیسا کہ وہ حواس خمسہ کا محتاج ہے۔ ایسے ہی قوۃ حافظہ سے بھی بے نیاز نہیں۔ پھر قوت حافظہ کے ضعف اور اُس سے امور کثیرہ کے فوت ہونے کا باعث بنجاتے ہیں اس لئے ایک قوۃ مذکرہ کی حاجت ہوئی۔ جو قوۃ حافظہ کی مددگار بنکر اُس کو وہ باتیں یاد دلا دیا کرے۔ جن سے ذہول ہو گیا ہو۔

ان سب کے بعد قوت مفکرہ خیال کی طرف متوجہ ہوتی ہے تاکہ قوت مصورہ کی توسط سے خیال کے حاصل کردہ امور کو اس طور پر ترکیب دے کہ اُس سے کسی دعویٰ کے متعلق ایسی دلیل پیدا ہو جاوے جس کی انتہا اُن محسوسات اور بدیہیات پر ہوتی ہو جو آدمی کی جبلت میں مرکوز ہیں اس طرح سے جب فکر دلیل کو ایک اچھی معقول صورت پر قائم کر دیتا ہے تو اب عقل انسانی اُس بنی بنائی چیز کو لیکر دعویٰ پر منطبق کر دیتی ہے۔

لیکن وہاں سے یہاں تک پہنچنے میں جتنی قوتوں کو کچھ بھی دخل رہا اُن میں سے کوئی ایسی نہیں جس کے کام میں بہت سے موانع اور بہت قسم کی غلطیوں کا مساغ

ہو۔ اور جس کے لئے کسی ایسے معیار کی ضرورت نہ پڑے جو صحیح کو فاسد سے اور مغز کو پوست سے جدا کر سکے۔

پس تم غور کرو کہ عقل فی ذاتہ کس قدر جاہل کیسی بے بس اور دوسری قوتوں کی کتنی حاجتمند ہے اور ان قوتوں میں سے ہر ایک کو جو اغلاط پیش آتے ہیں اور جہانتک کہ اُس کے دائرہ عمل کی تحدید کی گئی وہ بھی سب پر روشن ہو چکی لیکن اس پر جب اُس کو کوئی بات اس مخدوش اور پُر خطر طریق سے بہت سی ٹھوکریں کھا کر حاصل ہوتی ہے اور اُس کے مقابلہ میں دوسری جانب خود خداوند ربّ العزۃ کوئی خبر دیتا ہے۔ تو یہ کہکر وہ خدا کی بتلائی ہوئی بات کو ٹالدیتی ہے کہ میرا غور و فکر اس کو رد کر چکا ہے۔

اللہ اکبر یہ عقل خدا تعالیٰ کے مقابلے کس قدر جاہل ہے کہ اُس نے اپنے فکر ناقص کی تقلید میں خدا تعالیٰ پر جرح کرنے کو آسان سمجھا۔ حالانکہ تم پہلے سمجھ چکے ہو کہ عقل کے پاس بجائے خود کسی طرح کا اور کسی شے کا بھی علم موجود نہیں۔ اُس کا کام محض حواس خمسہ قوۃ خیالیہ۔ قوۃ مصورہ اور علیٰ ہذا القیاس دوسری قوتوں کی عطا کیے ہوئے علوم کو قبول کرنا ہے۔ تو ایسی حالت میں اُس کے لئے نہایت ہی مناسب تھا کہ وہ بجائے قوت فکریہ وغیرہ اپنے خدام کے سامنے دست سوال دراز کرنے اور اُن کے عطایا قبول کرنے کے اپنے آقا ربّ العزۃ کے روبرو ہاتھ پھیلاتے اور اُسی کی بخششوں کو لیکر سر اور آنکھوں پر رکھتے۔

اور جبکہ اُسے معلوم ہے کہ اُس کا فکر خیال کا مقلد ہے اور خیال حواس خمسہ کا اور اُس کے ساتھ ہی اُس کو اپنی امداد کے لئے قوۃ حافظہ اور مذکرہ کی بھی حاجت ہے اور یہ بھی علم ہے کہ یہ تمام قوی اپنی اپنی سرحد فطرۃ اور دائرہ عمل سے باہر ایک

قدم نہیں رکھ سکتے (مثلاً خوبصورت بدصورت کے ادراک میں کانوں سے کام نہیں چل سکتا۔ اور آوازوں کے بُرے بھلے کو آنکھیں نہیں سمجھ سکتیں خوشبو اور بدبو کا امتیاز زبان کے حدود عمل سے خارج ہے اور تلخ و شیریں کی تفریق سے ناک کو کوئی سروکار نہیں اور علیٰ ہذا القیاس خود عقل کو اپنی ذات کے اعتبار سے اُن چند ضروریات کے سوا جن کا علم فطرۃً ہوتا ہے اور کوئی چیز معلوم نہیں) تو بھلا تمام قوتوں کے اس طرح کی تنگ میدانی اور بیچارگی کے باوجود بھی کیا وجہ ہے کہ ہماری عقل اُس شخص کے قول کو قبول نہیں کرتی جو انسان میں قوۃ مفکر کے سوا ایک اور ایسی قوت کا قائل ہے جسکے احکام قوۃ مفکرہ سے بالاتر ہوں اور جس کو اُن طریقوں کے استعمال کرنے سے جو اس فن کے تجربہ کاروں نے لکھے ہیں بموہبت الٰہی اہل اللہ (ملائکہ) انبیاء اور اولیاء۔ کاملین اپنے اندر پاتے ہیں اور کل کتب سماویہ جس کے وجود کی خبر دیتے ہیں باواز دہل ناطق ہیں۔

اس لئے تمکو چاہیئے کہ اخبار الٰہیہ کے ماننے میں اپنی عقول (ناقصہ سقیمہ) کی کچھ پرواہ نہ کرو اور مخلوق کے مقابلہ میں خالق کی تقلید کو بہتر سمجھو کیونکہ کثیر التعداد انبیاء و اولیاء نے انہیں چیزوں کو قبول کیا اور انہیں پر وہ ایمان لائے اور انہیں کی تصدیق کی۔ اور ہمیشہ وہ اسی کو پسند کرتے رہے کہ اپنے رب کی معرفت میں خود اسی کی تقلید کرنا اپنے اوہام و افکار کی تقلید سے اولیٰ و انفع ہے۔ پھر او عقلمند منکر اخبار الٰہیہ سے انکار کرنے والے تجکو کیا ہوا کہ خدا کے بارے میں تو خود خدا کی اور اس کے برگزیدہ بندوں کی نہیں سُنتا اور اپنے خیالات کے پیچھے پڑا پریشان ہو رہا ہے۔

دیکھو جب یا ایھا الذین آمنوا آمنوا کے سُننے والوں کو یہ معلوم ہوا کہ علاوہ

اُس ایمان کے جو دلائل و افکار سے ہمکو حاصل ہو چکا کوئی دوسرا ایمان بھی مطلوب ہے، تو انہوں نے معًا ریاضت خلوۃ اور مجاہدہ کا طریق اختیار کیا اور خدا کو فراموش کرانے والے تعلقات کو یک لخت منقطع کر کے دُنیا میں ہوتے ہی وہ دُنیا سے الگ ہو بیٹھے۔ اور دل کو سب جھگڑوں سے خالی اور قلب کو شوائب افکار سے پاک کر کے خالص خدا کی طرف متوجہ ہوئے کیونکہ انبیاء و مرسلین سے یہی راستہ اُن کو معلوم ہوا تھا۔ اور انھوں نے سُن رکھا تھا کہ بندہ جب سارے دل سے خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو حق تعالیٰ بھی اُس پر اپنی مہربانی اور رحمت کا سایہ ڈالتا ہے اور اپنے دامن عطوفت میں لے لیتا ہے اس سے انہوں نے سمجھ لیا کہ خدا کی طرف جانیوالوں کے لئے فکر کے راستہ سے یہ راستہ زیادہ نزدیک ہے کیونکہ خود خداوند ربّ العزۃ نے اپنے رسُول کی زبان سے یہ منادی کرا دی کہ جو کوئی ہماری طرف لپک کر آتا ہے ہم اُس کی طرف دوڑ کر جاتے ہیں۔ اور یہ کہ نہ آسمان میں۔ نہ زمین میں۔ بلکہ فقط قلب مومن میں یہ وسعت ہے کہ وہ ہماری عظمت و جلال کا تحمل کر سکے۔

اس بنا پر یہ لوگ اپنے سارے دل سے خدا کی بارگاہ میں متوجہ ہوئے اور تمام قوی و افکار کے دھندوں کو چھوڑ دیا۔ اُس وقت خدا تعالیٰ نے اپنے نور میں سے علم صادق کی ایک روشنی اُن کے دلوں پر ڈال دی اور اُن کو خالص اپنا ہی والہ و شیدا بنا لیا۔ پھر کیا تھا۔ نظر و فکر کی وہ ساری کمزوریاں کافور ہو گئیں۔ اور خالق اکبر کے ارشادات و قوانین کے سامنے انہوں نے اپنی عقلوں کے تیار کئے ہوئے قانون کو بھُلا دیا۔ آہ۔

تم خود سوچو اور انصاف کرو کہ اگر ہر کس و ناکس اپنی عقل شخصی کے بنائے ہوئے قانون

پر چلنے کا مجاز کر دیا جاوے جیسا کہ آزاد خیالی کے مدعی آجکل چاہتے ہیں تو دُنیا میں کیا کچھ خرابطہ ہو اور ہزاروں لاکھوں خود تراشیدہ قوانین کی کشمکش میں (جو ہر گروہ اپنے پیمانۂ فکر اور اندازۂ فہم کے موافق تیار کر سکتا ہے) لوگوں کی زندگی کیا کچھ دشوار ہو جاوے بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب عقل و نقل میں مزاحمت واقع ہوا کرے اُس وقت ہم کو یہ اختیار ملنا چاہیئے کہ ہم عقل کے احکام کو نقل صحیح کی تسلیم سے مقدم سمجھیں کیونکہ نقل کے ماننے کا اصل ذریعہ بھی عقل ہی ہے۔ تو خدانخواستہ عقل کو بے اعتبار ٹھہرانے کے معنی یہ ہونگے کہ ہم عقل و نقل دونوں کی طرف سے بدگمان ہو گئے ہیں لیکن اس شبہ کا جواب آپ کو ہماری تقریر سابق سے بوجہ احسن معلوم ہو چکا ہے کیونکہ ہم مدلل طور پر بتلا چکے ہیں کہ عقل سلیم و نقل صحیح میں تعارض ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں اگر عقل کی سلامتی یا نقل کی صحت مخدوش ہو جاوے تو بیشک ایسا ہونا ممکن ہے مگر اُس وقت ہمارا پہلا فرض یہ ہوگا کہ یا تو اپنی عقل کو مرض سے چھڑانے اور سلامتی پر لانے کی کوشش کریں۔ اور یا نقل کے ثبوت کے واسطے کوئی قابل وثوق ذریعہ بہم پہونچائیں۔ ودونہ خرط القتاد۔

اس جواب کی پوری تفصیل شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ نے اپنی بیش بہا اور ضخیم کتاب[ع] بیان موافقۃ صریح المعقول الصحیح المنقول میں لکھی ہے جس کے جستہ جستہ اقتباسات بھی ہم باوجود قصد کے تطویل کے خیال سے قلم انداز کر کے آخر میں یہ گذارش کرتے ہیں کہ:۔

جو کچھ ہم نے اس مضمون میں یہاں تک بیان کیا ہے اُس کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ فکر

ع یہ کتاب اہل مصر نے منہاج السنۃ کے حاشیہ پر طبع کی ہے۔

و استدلال ایک محض عبث اور لغو چیز ہے یا اُس سے تعرض کرنا کوئی شرعی گناہ ہے۔ لیکن ہاں کسی فرد بشر کے واسطے ہم یہ جائز نہیں رکھتے کہ وہ اپنی عقل شخصی اور فکر ناقص کو اصل اصول ٹھہرا کر انبیاء علیہم السّلام کے پاک و صاف صحیح و صادق اور بلند و برتر تعلیمات کو زبردستی اُس پر منطبق کرنے کی کوشش کرے جس پر اکثر اوقات اُس کا ضمیر بھی خود اندر سے نفرین کر رہا ہو اس کے برخلاف نہایت ضروری ہے کہ انسان خدا اور اُس کے رسُولوں کے ارشادات کو اصل قرار دیکر اپنی عقل معلومات کو اُن کے تابع بناوے اور جو کچھ وہ فرمائیں اس کو اپنے امراض روحانی کے حق میں اکسیر شفا تصور کر کے سمعاً و طاعۃً کہتا ہوا بلا حجت و تکرار سر اور آنکھوں پر رکھے۔

والذین یحاجون فی اللہ من بعد ما	اور جو لوگ اللہ کے بارہ میں نبی سے جھگڑا کرتے ہیں جبکہ ادمی
استجیب لہ حجتھم داحضۃ عند ربھم	اُس کی بات قبول کر چکے تو اُن کی حجت باطل ہے اور اُن پر خدا تعالیٰ
وعلیھم غضب ولھم عذاب شدید	کا غضب ہے اور انکے لیے سخت عذاب ہے۔

تتمہ

جو کچھ ہم نے اس رسالہ میں اپنے نزدیک اختصار جامع اور متانت و معقولیت کے ساتھ لکھا ہے۔ اُس کا زیادہ تر زور (جیسا کہ ناظرین محسوس فرمائینگے) عقل کی صحت و سلامتی پر رہا ہے۔ لیکن نقل کی صحت و ضعف کے قواعد و شرائط وغیرہ سے یہاں مطلقاً بحث نہیں کی گئی جس کے واسطے اوّل تو علم اصول حدیث کی کتابوں

کا مطالعہ انشاء اللہ تعالیٰ کافی ہوگا۔ اور اگر وقت نے مساعدت اور قادر مطلق نے امداد فرمائی تو ہم ایک مستقل رسالہ اس موضوع کے متعلق بھی لکھکر اہل ملک کے روبرو پیش کرینگے جس میں مولانا عبد اللہ العمادی کے رسالہ علم الحدیث پر بھی مبسوط تبصرہ کیا جاویگا۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

الراقم

شبیر احمد۔ عثمانی۔ عفا اللہ عنہ

دار العلوم۔ دیوبند

۲۲ ربیع الثانی
۱۳۳۳ھ